سلطان محمد بن تغلق شاہ اور بنو عباس

پروفیسر علی محسن صدیقی

سلطان محمد بن تغلق (۷۲۵ھ تا ۷۵۲ھ = ۱۳۲۵ تا ۱۳۵۱ء) نہ صرف اپنے پیش رو سلطان غیاث الدین تغلق شاہ اور اپنے جانشین سلطان فیروز شاہ سے، بلکہ تمام سلاطین دہلی سے بے حد مختلف تھا۔ وہ ان سے مدرسی علوم وفنون میں افضل تھا۔ اس نے اپنے عہد کے جید علماء سے کسب فیض کیا تھا اور علوم متداولہ پر اسے دسترس حاصل تھی۔ وہ نرا مقلد نہ تھا، بلکہ علوم پر مجتہدانہ نظر رکھتا تھا اور غور وفکر اس کی عادت ثانیہ تھی۔ کورانہ تقلید اور غلو آمیز عقیدت سے، علمی مباحث کی حد تک، وہ کوسوں دور تھا۔ وہ اپنے عہد کے قضاۃ، علماء فقہاء وفلاسفہ سے علمی مجالس اور نجی محافل میں عالمانہ گفتگو کرتا، اپنے موقف پر دلائل دیتا اور انہیں قائل کرتا تھا۔ ظاہر ہے ایک ایسا شخص، جیسا کہ سلطان تھا، مطلق انسانی اقتدار کے سبب جادۂ اعتدال سے منحرف اور غرور دانش کے فتور سے شتر بے مہار ہو جاتا ہے۔ اس کی ناخوش اندیشی، اکثر خرد کے دائرے سے نکل کر جہل کے حلقہ میں داخل ہو جاتی ہے۔ اپنی رائے کی اصابت پر اسے اصرار ہوتا ہے اور جب اس کے نفاذ پر اسے مستبدانہ قدرت بھی حاصل ہو، تو حق باطل سے، علم جہل سے اور عدل ظلم سے بدل جاتے ہیں، نہ ایسے شخص کو اس کے فریق مخالف کے دلائل مطمئن کر سکتے ہیں اور نہ تحمل وحلم، کہ علم وآگہی کا فیضان ہوتے ہیں، اسے اعتدال کی راہ پر گامزن ہونے پر مجبور کر سکتے ہیں۔ سلطان محمد بن تغلق وفور علم اور فتور عقل کی غیر متوازن طاقت کے باعث غیر معتدل شخصیت کا مالک اور بقول مورخ برنی ''مجموعہ اضداد'' تھا[۱]۔ اس کی چھبیس (۲۶) سالہ سلطانی علم بے محابا اور عقل خیرہ سر کی بوالعجبیوں کی ایک عبرت انگیز اور افسوس ناک داستان ہے۔

سلطان محمد بن تغلق شاہ کی ان ناخوش اندیشیوں کے باعث اس کے مداح روز بروز کم ہوتے گئے اور اس کے نکتہ چیں دن دن بڑھتے گئے۔ اس کی وسیع وعریض سلطنت کے حدود سکڑتے گئے، نتیجتاً اس کے مسائل گھمبیر ہوتے اور اس کا بے تاب مزاج چڑ چڑا ہوتا گیا۔ ویسے بھی عفوو درگزر کی اعلیٰ صفات اس کی کتاب اخلاق میں شاذ ونادر ہی تھیں۔ مسلسل ناکامیوں نے ان نادر الوجود خوبیوں کو یکسر محو کر دیا۔ اس کے مزاج میں سختی اور اس کے عمل میں تشدد کے عنصر نمایاں ہونے لگے۔ معمولی جرائم کی سزا قتل اور ان بے جا وفرضی الزامات سے انکار قتل کے ساتھ تعذیب کی صورت میں رونما ہونے لگا۔ وہ نت نئی اسکیمیں سوچتا، اس کا پندارہ بے محابا اقتدار سے قوی دست تھا۔ ان اسکیموں کو قوت سے فعل میں اور خیال محض سے عمل میں لانے پر سیماب وش بے تاب رہتا تھا۔ وفور علم وعقل اور اقتدار مطلق العنان نے اسے یہ باور کرا دیا تھا کہ محال وناممکن نام کی کوئی چیز نہیں ہے، وہ اپنے زرخیز دماغ اور بے پایاں ملکی دولت کے بل پر ''قراچل'' کی سنگستان فیصلوں کو منہدم کر سکتا ہے، خراساں کے مرغزاروں اور ریگستانوں کو ذرۂ بے مقدار کی طرح روند سکتا ہے اور مسِ خام کو زرِ خالص کا متبادل بنا سکتا ہے[۲] ان خیال آفرینوں نے کہ خام خیالی کی گود میں پل کر جوان ہوئی تھیں اور جنھیں عمل کی کسوٹی پر پرکھنے کی زحمت گوارا نہ گئی تھی، سلطان کی ابتدائی کامیابیوں کو ناکامیوں کی بھینٹ چڑھا دیا اور اپنی عقل ودولت کی طاقت کے بل پر ناممکن کو ممکن بنا دینے کی سعی لاحاصل نے اسے صلاح ومشورہ کی افادیت سے بے بہرہ کر دیا۔ ہر وہ مشورہ جو اس کی رائے کے خلاف ہوتا، اس کے نزدیک حکم عدولی کے زمرے میں آتا اور اسکی یہ خود پرستی، کہ جہل کی گود میں پلی تھی، مزید تشدد، سختی اور ظلم کا سبب بنی۔ اس کی بے اعتدالیوں کا یہ سیل بے پناہ اس کی اعلیٰ صفات کو بھی اپنے ساتھ بہا لے گیا[۳]۔

سلطان محمد بن تغلق بادشاہی سے متعلق ایک مخصوص نظریہ رکھتا تھا۔ اس کے وسیع مطالعہ اور طویل غور وفکر نے اس نظریہ کو ہر قسم کے نقص سے پاک اور درست قرار دیا تھا، اور اس کے خیال میں وہی معیارِ حق اور میزانِ صداقت تھا۔ وہ علماء وامراء سے بحث کرتا اور زعم خرد کے سبب یہ نظریہ

مزید موثق و معتبر ٹھہرتا۔ ایسا نہیں تھا کہ اس عہد میں جید علماء و فضلاء نہ تھے، جو سلطان پر علمی فضیلت رکھتے ہوں، مگر مشکل یہ تھی کہ وہ ان کے دلائل کو پاور ہوا سمجھتا تھا اور یہ اصحاب علم و فضل اس کے جبر کی باعث دلائل کی فصیلیں یا تو تعمیر نہ کر پاتے یا پھر سلطان اپنی خام خیالی اور خیرہ سری کی وجہ سے ان دلائل اور براہین کو ہوائی قلعوں سے زیادہ اہمیت نہ دیتا اور یہ فضلاء مجبوراً خاموش ہو جاتے تھے۔ آئین جہاں بانی اور دستور حکمرانی سے متعلق سلطان کے خیالات کا کسی قدر اندازہ ان چند اوراق سے بھی لگایا جاسکتا ہے جو اس کی خودنوشت کی صورت میں ہم تک پہنچتے ہیں[۴]۔ اس عہد کے نامور مورخ ضیاء الدین برنی کا ''فتاوائے جہاں داری''، قیاس چاہتا ہے کہ سلطان کے اسی مزعومہ آئین جہاں داری کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ وہ ''ترک ساسانی آئین بادشاہی'' کے مطابق عوام و خواص پر امر و نہی کے مستبدانہ اختیارات کا مالک تھا۔ اور اسلام نے انھیں تائید مزید مہیا کی تھی۔ اس کے خیال میں ''الدین والملک توامان'' یعنی مذہب اور سلطنت دونوں جڑواں تھے۔ اس بناء پر اپنے ہر منصوبہ پر عمل کرنے سے پہلے وہ قضاۃ، فقہاء و علماء سے بحث کرتا اور اپنے موقف کی تائید میں دلائل دیتا تھا[۵]۔

سلطان بجا طور پر یہ سمجھتا تھا کہ اسلام میں سیاسی قوت کا منبع ''خلافت و امامت'' کا منصب ہے۔ اور ''سلطنت'' کو اسی وقت اعتبار و اختیار حاصل ہو سکتا ہے جب اسے اسلامی اصول کے تحت برپا ہونے والی ''خلافت و امامت'' کی جانب سے سند توثیق عطا کی جائے۔ اسلامی سیاسی فکر پر لکھنے والوں مثلاً ابوالحسن علی الماوردی، عبدالقاہر البغدادی اور ابویعلیٰ الفراء وغیرہ کے ہاں دوسری صدی ہجری (۱۳۲ھ/۷۵۰ء) میں قائم ہونے والی بغداد کی ''خلافتِ عباسیہ'' کو یہ حیثیت حاصل تھی۔ ۶۵۶ھ/۱۲۵۸ء تک ''خلافت عباسیۂ بغداد'' کو دنیائے اسلام کا جائز اسرہ حاکمہ خیال کیا جاتا تھا۔ ہر چند کہ تیسری صدی ہجری کے وسط (۲۴۷ھ/۸۶۱ء) میں خلافت عباسیہ اپنا بالفصل اقتدار کھو چکی تھی، لیکن سامانی، غزنوی اور سلجوقی سلطنتیں اسی سے سند حکومت حاصل کرتی تھیں، اور بظاہر بے دست و پا خلیفہ کے عطاء کردہ اختیارات حکمرانی کی اساس پر ان کی

ہمہ مقتدر سلطنتیں قائم تھیں[۶] ''سلطنتِ دہلی'' غزنویوں اور غوریوں کی سلطنتوں کا یک گونہ تسلسل تھی، اسی لیے اسے بھی ''خلافت عباسیہ'' سے سند حکومت حاصل کرنی تھی تا کہ اسے جائز اور درست قرار دیا جاسکے۔ چنانچہ ''سلطنتِ دہلی'' نے اپنے دوسرے سلطان شمس الدین التتمش (۶۳۳۔۶۰۷ھ/ ۳۵۔۱۲۱۰ء) کے عہد میں عباسی خلیفۂ عصر امیر المومنین المستنصر باللہ (۶۴۰۔۶۲۳ھ/۱۲۴۲۔۱۲۲۶ء) سے ۶۲۶ھ /۱۲۲۹ء میں باقاعدہ حکومت، نیابتِ اقتدار اور خلعتِ بادشاہی حاصل کی تھی۔ اگرچہ ۶۲۲ھ /۱۲۲۵ء میں عباسی خلیفہ امیر المومنین الناصرلدین اللہ (۶۲۲ھ۔۵۷۵/ ۱۲۲۶۔۱۱۸۰ء) کے دربار سے سلطان شمس الدین التتمش کو سند حکومت مل چکی تھی، لیکن باقاعدہ ''سندتوثیق'' اس کے پوتے امیر المومنین المستنصر باللہ کے عہد میں عطاء کی گئی۔ ۶۵۶ھ (۱۲۵۸ء) میں ''تاتارگردی'' کے نتیجہ میں ہولاکو کے ہاتھوں آخری عباسی خلیفہ امیر المومنین المستعصم باللہ (۶۵۶۔۶۴۰ھ/ ۱۲۵۸۔۱۲۴۲ء) کی شہادت کے ساتھ عباسیوں کی خلافت ختم ہوگئی لیکن کم از کم سلطان غیاث الدین بلبن (۶۸۶۔۶۶۴ھ/ ۱۲۸۷۔۱۲۶۶ء) کے عہد تک ''سلطنت دہلی'' میں اسی عباسی امیر المومنین کا خطبہ پڑھا جاتا رہا اور اس کی نیابت میں سلاطینِ دہلی حکومت کرتے رہے، اگرچہ اس کی بساط خلافت کب کی الٹ چکی تھی۔ یہ صورت حال، ایک سیاسی مجبوری کا منطقی نتیجہ تھی[۷]

سلطان محمد بن تغلق کو اپنی حکومت کو ''نظریاتی بنیاد'' فراہم کرنے کی غرض سے خلافت کی جانب سے ''سندتوثیق'' کی ضرورت تھی لیکن اس وقت تک ''آں کوزہ بشکست وآب بریخت'' اور ''خلافت عباسیہ'' کب کی مرچکی تھی۔ خلافتِ عباسیہ کے ہولاکو کے ہاتھوں تہس نہس ہوجانے کے بعد مصر میں ''ممالک مصروشام'' کی ''تولیت'' میں ۶۵۹ھ (۱۲۶۲ء) میں ایک ''برائے نام'' عباسی خلافت قائم ہوئی جو ۹۲۳ھ (۱۵۱۷ء) تک ''ممالیک مصر'' کی حکومت کے ساتھ قائم رہی۔ اسی خلافت کی عطاء کردہ ''سند جواز'' کی بناء پر سلاطین مملوک، مصر، شام اور یمن پر حکومت کرتے تھے[۸] سلطان محمد بن تغلق کی نگاہ اسی مصری عباسی خلافت کی جانب اٹھی۔ ۷۴۴ھ (۱۳۴۳ء)

میں اس کی درخواست پر قاہرہ سے دہلی سفارت آئی۔ اس وقت کے عباسی خلیفہ مصر الحاکم بامر اللہ (۴۸-۱۴۱ھ/ ۴۷-۱۳۴۹ء) کی جانب سے تشریف خلافت، پروانۂ حکومت اور لوائے حاکمیت دہلی آئے [۹] خلیفہ کے قاصد حاجی سعید صرصری کا شاندار استقبال کیا گیا۔ سلطان نے اس کی پذیرائی میں حد درجہ غلو سے کام لیا اور اس میں اس قدر اہتمام کیا کہ عقل اس کی توجیہہ کرنے سے قاصر ہے مثلاً سلطان تمام امراء علماء و معارف کے ہمراہ پاپیادہ اور ننگے پاؤں اس کے حضور گیا، اس کے پاؤں کو بار بار سر بر زمین ہو کر بوسہ دیا۔ شہر کو بڑے اہتمام سے سجایا گیا۔ بقول مورخ برنی سلطان نے سورگ دواری اور بعد ازاں دہلی سے مصر کے مسلوب الاختیار اور بے حیثیت عباسی خلیفہ سے منشور حکومت، نیابت اقتدار اور لواء حاکمیت کی درخواست کی۔ دہلی میں اپنے نام کے سکّے مسکوک کرنے کا کام معطل کر دیا، جمعہ اور عیدین کی نمازوں کو موقوف کر دیا۔ حاجی سعید صرصری کو اپنے ساتھ تخت خلافت پر بٹھایا اور جب وہ تخت سے اتر کر اپنی قیام گاہ پر جانے لگا تو خود تخت سے اتر کر اپنے دونوں ہاتھ زمین پر رکھے اور اسکے پاؤں کو زمین بوس ہو کر چوما۔ اس کے دو سال بعد جب ایک دوسرا مصری سفیر اور شیخ الشیوخ دہلی آئے تو ان کے اعزاز و اکرام میں ایسے ایسے اہتمام کیے گئے کہ باید و شاید، انھیں تخت پر بٹھایا گیا، ان کے پاؤں چومے گئے اور نہایت گراں قدر تحائف مصر بھیجے گئے۔ حکم دیا گیا کہ خطبوں میں صرف انھیں سلاطین کے نام لیے جائیں جن کو خلیفہ کی جانب سے، حکومت کے اختیارات عطا ہوئے ہوں بصورت دیگر وہ سلاطین متغلب ہیں اور ان کی حکومتیں ناجائز۔ سلطان محمد بن تغلق کی عباسیوں سے یہ کورانہ عقیدت تمام حدود عقل سے متجاوز تھی۔ ابن بطوطہ نے بغداد کے ایک فرد غیاث الدین محمد عباسی کا ذکر کیا ہے۔ یہ شخص چھتیسویں عباسی خلفیہ بغداد المستنصر باللہ کی نسل میں تھا۔ بغداد میں وہ حد درجہ مفلوک الحالی کی زندگی گزار رہا تھا اور کسی مسجد میں پیش امام تھا اور ایک درم یومیہ اجرت پاتا تھا۔ اسے پتا چلا کہ ماوراء النہر کا ترک حکمراں سلطان علاء الدین ترمہ شیریں نیا نیا مسلمان ہوا ہے اور فقراء و مساکین کی خبر گیری کرتا ہے۔ چنانچہ یہ غیاث الدین محمد بغداد سے ماورالنہر روانہ ہوا۔ اور بغداد کی مسجد کی

امامت اپنے صاحب زادے کے حوالہ کردی، سمرقند میں سلطان ترمہ شیریں نے اس بزرگوار کو حضرت قثم بن عباسی کے مزار کا مجاور مقرر کردیا، یوں اس کی معاش کا دھندا چل نکلا یہیں اس شخص کو بادشاہِ ہندوستان سلطان محمد بن تغلق کی عباسیوں سے عقیدت کا علم ہوا چنانچہ بغداد کا یہ مفلس پیش امام اور سمرقند کا یہ مجاور ہندوستان چل پڑا۔ یہاں پہنچ کر قسمت اس پر کس قدر مہربان ہوئی یہ داستان ابن بطوطہ کی زبانی سنئے اور سلطان کی سیرت کے اس پہلو پر غور کیجیے [۱۰]

''غیاث الدین محمد عباسی نے ماوراء النہر کے قیام کے زمانہ میں سلطان محمد بن تغلق کی دریا دلی اور بنو عباسی سے اس کی بے پناہ عقیدت کا حال سنا، تو دولت کمانے کی حرص اس کے سینے میں مچلنے لگی۔ اس نے ایک خط کے ساتھ اپنے دو قاصدوں کو دہلی روانہ کیا۔ دہلی پہنچ کر ان دونوں نے عباسی کا عریضہ سلطان کی خدمت میں پیش کیا۔ سلطان نے دہلی میں موجود بعض لوگوں سے اس کے نسب کے بارے میں دریافت کیا، ان لوگوں نے اس کے صحیح النسب ہونے کی گواہی دی۔ چنانچہ سلطان نے عباسی کو دہلی آنے کی دعوت دیدی اور اپنے دست خاص سے اسے ایک خط تحریر کیا جس میں اس کی تعظیم وتکریم میں بڑا مبالغہ کیا اور دہلی تشریف لانے کی مودبانہ درخواست کی۔ دونوں قاصدوں کو پانچ (۵) ہزار اشرفیاں (دینار) پیش کیں اور عباسی کی خدمت میں (۳۰) ہزار اشرفیوں کا نذرانہ بطور زادراہ ماوراء النہر روانہ کیا۔ سلطان کے مکتوب اور زادِراہ کی خطیر رقم موصول ہونے کے بعد غیاث الدین محمد عباسی سمرقند کی مجاوری چھوڑ کر دہلی روانہ ہوا۔ جب وہ سندھ کی سرحد میں داخل ہوا تو خبرنویسوں نے اس کی آمد کی اطلاع دہلی بھیجی۔ یہاں سے سلطان نے عباسی کی پذیرائی اور عزت افزائی کی غرض سے امرء دربار کو روانہ کیا۔ بعدازاں جب وہ سرستی پہنچا تو دہلی سے اس کے استقبال کے لیے صدر جہاں قاضی القضاۃ کمال الدین غزنوی اور فقہاء کی ایک جماعت کو وہاں بھیجا۔ اس کے فوراً بعد امراء دربار کو خیر مقدم کے لیے بھیجا۔ جب عباسی دارالحکومت دہلی کے مضافات میں قصبہ مسعود آباد آیا، تو سلطان بنفس نفیس اس کے استقبال کے لیے امراء، فقہاء اور درباری مشائخ کے جلوس میں دہلی سے مسعود آباد گیا۔ جب غیاث الدین محمد عباسی نے

سلطان کی سواری دیکھی تو پیادہ پا ہوگیا۔ سلطان بھی اس کے احترام میں گھوڑے سے اتر کر زمین بوس ہوا اور آداب دکورنش بجالایا۔ عباسی نے بھی یہی عمل دہرایا۔ اس کے بعد عباسی نے پارچہ جات کے تختے (تمان) سلطان کی نذر کیے۔ سلطان عام آدمی کی طرح خدام کے انداز میں ان پارچہ جات کو اپنے کندھے پر رکھ کر زمین بوس ہوکر آداب بجالایا۔ اس زمین بوسی، آداب وتسلیمات کے بعد سلطان نے شاہی اسپ خاص کی لگام پکڑ کر سواری کے لیے عباسی کی خدمت میں پیش کیا اور بڑے اصرار سے اس پر سوار ہونے کی درخواست کی۔ جب تک عباسی اس راہوار شاہی پر سوار نہ ہولیا، سلطان خدام کی طرح اس کی رکاب تھامے کھڑا رہا۔ عباسی کے سوار ہونے کے بعد سلطان سوار ہوا اور یہ جلوس دارالحکومت کی سمت تزک واحتشام سے روانہ ہوا۔ چتر شاہی جو سلطان کے امتیازات میں سے ہے، وہ سلطان کے ساتھ عباسی کے سر پر بھی سایہ فگن رہا (گویا اقتدار حکومت میں وہ بھی سلطان کا سہیم وشریک تھا)۔ اثنائے راہ میں سلطان نے اپنے دست مبارک سے اپنے خاصہ کا ایک ''بیڑۂ پان'' نکال کر ''مقدس مہمان'' کی خدمت میں پیش کیا۔ یہ ایسا اعزاز تھا جس کی کوئی مثال نہیں ملتی، کیونکہ سلطان کسی کو ''بیڑۂ پان'' اپنے ہاتھ سے پیش نہیں کرتا تھا۔ بہر کیف ''مہمانِ گرامی'' نے اسے قبول کر کے نوش جان فرمایا (بغداد کے قلاش ملا اور سمر قند کے مجاور نے جب پہلی بار ''بیڑۂ پان'' کو نوش فرمایا ہوگا تو اس پر کیا گزری ہوگی، اس کا کچھ اندازہ ان حضرات کو ہوسکتا ہے جنھوں نے پہلی مرتبہ کسی ''تقریب سعید'' میں ''خاصدان'' کے ''بیڑۂ تنبول'' سے مجبوراً کام ودہن کو آلودہ اور خود کو سرخ رد کیا ہوگا۔ خیر سے عباسی یہ کڑی جھیل گیا، کیونکہ بعد میں اس کی اس ''منہ زوری'' سے اس کی کسی بیماری وناآرامی کا پتا نہیں چلتا)۔ دارالخلافہ کے اس سفر کے دوران سلطان نے نہایت عاجزی سے کہا ''اگر میں نے عباسی خلیفہ مصر ابوالعباس کی بیعت خلافت نہ کی ہوتی، تو آپ کی بیعت کر لیتا''

جواب میں عباسی نے کہا اس نے بھی اسی مصری عباسی خلیفہ کی بیعت کر رکھی ہے (حیرت ہے کہ مصر کے عباسی خلفاء ممالیک مصر کے قیدی تھے اور مصر، شام ویمن کے باہر ان کا

کوئی عمل دخل نہ تھا، بغداد میں رہنے والا عباسی کہ سلاطین ''ایل خانی'' کی رعایا، بلکہ وظیفہ خوار تھا، یا سمرقند جا کر ترکان چغتائیہ کا زلہ رہا تھا، کسی مصری خلیفہ کی بیعت کیسے کرسکتا تھا، خیال ہے کہ اس نے سلطان کی خام خیالی کی پختگی کی خاطر یہ سخن سازی کی ہوگی)۔

قصہ مختصر جب یہ سواری اس سراچہ (سراچہ، سراپردہ، خیمۂ راوٹی) کے قریب پہنچی جو سلطان کے قیام کے لیے تیار کیا گیا تھا، تو سلطان نے اس میں عباسی کو ٹھہرایا اور اپنے قیام کی غرض سے ایک دوسرا سراچہ برپا کر دیا۔

دونوں نے وہ رات شہر کے باہر بسر کی۔ دوسری صبح یہ جلوسِ شاہی مسعود آباد سے چل کر ''دارالملک'' میں داخل ہوا۔

سلطان نے غیاث الدین محمد عباسی کو مستقل سکونت کی غرض سے ''سیری'' کا شہر عطا فرمایا۔ اس کی ذاتی رہائش کے لیے وہ محل دیا جسے سلطان علاء الدین خلجی اور سلطان قطب الدین مبارک خلجی نے تعمیر کرایا تھا۔ اس کی گھریلو ضروریات کے لیے سونے اور چاندی کے برتن بھجوائے، ان میں ایک مغتسل (نہانے کی ناند، Bathing Tub) بھی تھا جو سونے کا تھا۔ عباسی کی خدمت اور خانگی امور کی انجام دہی کی غرض سے نوجوان چھوکرے، خدمت گزار اور نوخیز چھوکریاں مہیا کی گئیں (غسل الراس، سرشتی)، ''سر دھونے'' کے نام سے چار لاکھ اشرفیاں (دینار، تنکۂ زر) عباسی کی زندگی کی نذر کی گئیں (سرشتی اس رقم کو کہتے تھے جو سلطان ہر نو وارد کو اس کی حیثیت کے مطابق اصلاح حال اور ضروری اخراجات کی مد میں دیتا تھا) غیاث الدین محمد عباسی کے دیگر اخراجات کے لیے تین (۳) سو اشرفیاں (دینار) یومیہ مقرر کی گئیں۔ انواع و اقسام کے کھانے کے خوان اس پر مستزاد تھے۔ سارا شہر سیری مہمان گرامی قدر کو عطاء کر دیا گیا یعنی شہر مذکور کے تمام مکانات، قطعات، باغات، ذخیرہ اور اراضی اسے ہبہ کر دی گئیں۔ مزید برآں ایک سو (۱۰۰) دیہات نذر کیے گئے۔ دہلی سے متصل پورب کے سارے قصبات و دیہات عباسی کی جاگیر میں دیئے گئے۔ باربرداری کے لیے تیس (۳۰) خچر دیئے گئے جن کی زینیں زرین تھیں۔ ان خچروں

کے چارے کی ذمہ داری مخزن (سلطانی انبار خانہ) کے ذمہ تھی (سلطان نے جو عنایتیں غیاث الدین محمد عباسی پر کیں ان کی بدولت وہ مال وزر اور اعزاز وکرام کی اس بلندی پر پہنچ گیا جو اس کے قرابت دار مصر کے عباسی سجادہ نشینِ خلافت کی بھی پہنچ سے بالاتر تھی، بلکہ بغداد کے آخری، مسلوب الاختیار خلفاء بھی اس سربلندی کی آرزو ہی کر سکتے تھے اور زبان حال سے یہ کہتے تھے ''اے بسا آرزو کہ خاک شدہ''۔

غیاث الدین محمد عباسی کے اعزاز واکرام میں سلطان نے حد درجہ اہتمام کیا، مثلاً یہ حکم دیا گیا کہ عباسی قصر شاہی میں آئے تو اپنی سواری سے نہ اترے اور وہاں تک سوار آئے جس سے آگے سلطان کے سوا کوئی دوسرا سوار ہو کر نہیں جا سکتا تھا۔ سلطان نے ہر خرد وکلاں کو یہ حکم دیا کہ عباسی کی پذیرائی اسی طرح کی جائے اور زمین بوسی، کورنش اور آداب ویسے ہی بجالائے جائیں جیسے کہ خود سلطان کے لیے بجالائے جاتے ہیں۔ چنانچہ عباسی سلطان کی خدمت میں حاضر ہوتا، تو سلطان تخت سے اتر کر اس کا استقبال کرتا، کورنش بجالاتا اور اپنے برابر تخت پر بٹھاتا تھا۔ اگر سلطان کرسی پر بیٹھا ہوتا تو عباسی کے احترام میں کھڑا ہو جاتا دونوں کورنش بجالاتے، ایک اور کرسی لائی جاتی جس پر وہ براجمان ہوتا'' [۱۱]۔

ہم نے سطورِ گزشتہ میں غیاث الدین محمد عباسی کی حد سے بڑھی ہوئی تعظیم وتکریم اور سلطان محمد بن تغلق کی غلو آمیز وحیرت خیز عقیدت کا حال نہایت اختصار کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ جو شخص اپنی خود پسندی وخیرہ سری کے باعث خود کو عقل کل، ہمہ مقتدر وصاحب فہم وذکاء خیال کرتا تھا، ایک معمولی شخص کے ساتھ سفاہت انگیز ''کسر نفسی'' کا جو'مظاہرہ'' کر رہا تھا، ایا دہ عقل کی روباہ صفتی تھا یا بد عقلی کی ابلہ فریبی محمد عباسی ہی نہیں کہ بے زر تھا، کہ سلطان کی غلط بخشیوں نے اسے زردار بنا دیا، بلکہ وہ بخل وتقطیر کی خوئے بد کا شکار بھی تھا۔ قطع رحم اور کج خلقی کے عیوب اس بخل پر مستزاد تھے۔ ہم ابن بطوطہ سے محمد عباسی کی سیرت کے اس پہلو سے متعلق چند واقعات نقل کریں گے کہ خواجہ شیراز کے اس شعر کا مصداق وہی ہے [۱۲]

اسپ تازی شدہ مجروح بزیر پالاں
طوقِ زریں ہمہ درگردنِ خرمی بینم

''میری (ابن بطوطہ کی) غیاث الدین محمد عباسی سے دوستی تھی اور اکثر اس کے ہاں جاتا رہتا تھا۔ میں نے یہ دیکھا کہ وہ ہمیشہ تنہا کھانا کھاتا تھا اور اس کے دسترخوان پر اس کا کوئی دوست یا میزبان شریک طعام نہ ہوتا تھا۔ ایک دن میں نے اس کا سبب دریافت کیا تو اس نے بڑی صفائی سے اس بات کا اعتراف کیا وہ اپنے ساتھ کسی اور کو کھانا کھاتے دیکھ نہیں سکتا اور اس صدمہ کو برداشت کرنے کی اس میں ہمت نہیں ہے''۔

''بخل کی وجہ سے اس کے محل کی ڈیوڑھی میں کبھی چراغ جلتے میں نے نہیں دیکھا، حالانکہ روشنی نہ ہونے کی وجہ سے وہاں آنے والوں اور وہاں سے جانے والوں کو جن میں وہ بھی شامل تھا، بڑی زحمت ہوتی تھی''۔

''ایک دفعہ میں نے دیکھا، وہ اپنے باغ میں چھوٹی چھوٹی لکڑیاں چن رہا تھا، دریافت کرنے پر بتایا کہ مجھے ان لکڑیوں کی ایندھن کے لیے ضرورت پڑتی ہے۔ چنانچہ ان لکڑیوں سے محل کا مخزن (گودام) بھرا پڑا تھا''۔

''مجھ پر دہلی کے قیام کے زمانہ میں ایک ایسا وقت بھی آیا کہ میں مقروض ہو گیا، قرض خواہوں کے بار بار کے تقاضوں نے میرا ناک میں دم کر دیا۔ میں نے عباسی سے قرض بھگتانے کی غرض سے قرض مانگا اور وعدہ کیا کہ جاگیر سے رقم آتے ہی ادائیگی کر دوں گا، لیکن عباسی ٹس سے مس نہ ہوا اور مجھے قرض نہ دیا۔ اس واقعہ کے کچھ دنوں بعد جب میرے پاس رقم آ گئی اور میں نے قرض ادا کر دیا، تو عباسی نے مجھے یہ بتایا کہ ''میں تمھاری پریشانیوں سے فکرمند ہوا اور چاہا کہ تمھیں قرض دیدوں، مگر اس رقم کی بھرپائی میرے بس میں نہ تھی اور اس صدمہ کو برداشت کرنے کا مجھ میں حوصلہ نہ تھا''۔

اب غیاث الدین محمد عباسی کی دولت مندی اور اپنے مفلوک الحال بیٹے کی ''دُرِوشا''

سے بے حسی کا واقعہ بھی سنیئے۔

''میں (ابن بطوطہ) ہندوستان سے واپسی پر بغداد گیا، وہاں المستنصر یہ (یونیورسٹی) کے صدر دروازہ پر بیٹھا ہوا بعض طلبہ سے بات چیت میں مشغول تھا کہ ایک خستہ حال و پراگندہ بال نوجوان کو (یونیورسٹی کے) دروازہ سے نکلنے والے ایک شخص کے پیچھے بھاگتے ہوئے دیکھا۔ مجھے یہ منظر بڑا عجیب سا لگا، میں نے ایک طالب علم سے دریافت کیا، ماجرا کیا ہے؟ اس نے مجھے بتایا کہ یہ نوجوان جسے آپ دیکھ رہے ہیں، غیاث الدین محمد عباسی کا، جس کو آپ نے ہندوستان میں ضرور دیکھا ہوگا، بیٹا ہے۔ یہ سن کر میں نے اسے اپنے پاس بلایا اور اس سے کہا کہ میں حال ہی میں ہندوستان سے آیا ہوں، وہاں تمھارے والد کی شان و شوکت اور دولت مندی کا میں نے مشاہدہ کیا ہے، کیا وہ تم لوگوں کی مالی مدد نہیں کرتے؟'' نوجوان نے بڑی بیزاری سے کہا ''ہمیں ان باتوں کا علم ہے''۔ یہ کہہ کر وہ بڑی تیزی سے اس آدمی کے پاس پہنچ گیا۔ میرے پوچھنے پر اس طالب علم نے بتایا کہ یہ شخص جیل کا ناظر (انسپکٹر) ہے اور یہ نوجوان کسی مسجد کا امام ہے جس کی اجرت ایک درم یومیہ ہے اور یہ ناظر بندی خانہ اسے یہ اجرت دیتا ہے۔ اب اگر یہ ناظر اس نوجوان کے ہاتھ سے نکل گیا، تو بیچارہ ایک دن کی مزدوری سے محروم رہ جائے گا۔ یہ سن کر مجھے عباسی کی بے حسی اور قطع رحمی پر سخت تعجب ہوا کیونکہ عباسی کو مختلف موقعوں پر جو شاہی خلعت ملتی تھی، اگر اس میں ٹنکے ہوئے ہیروں میں سے ایک ہیرا بھی وہ اپنے اس نادار بیٹے کو بغداد بھیج دیتا، تو وہ فاقہ کشی اور اس ذلت آمیز اجرت کے لیے گداگرانہ عمل سے محفوظ ہو جاتا۔ اللہ تعالیٰ اس ''حال بد'' سے اپنے بندوں کو اپنی پناہ میں رکھے'' [۱۴]

غیاث الدین محمد عباسی کی تنگ مزاجی، کج خلقی اور سلطان محمد بن تغلق کی چاپلوسی اور سفلگی کے اس واقعہ کو نقل کر کے ہم، اس بات چیت کے دوسرے پہلو کی جانب متوجہ ہوں گے اور ان مصری عباسی خلفاء کی مسکنت کا کسی قدر اختصار میں ذکر کریں گے:۔

ابن بطوطہ رقم طراز ہے کہ غزنین کا بادشاہ بہرام دہلی آیا۔ سلطان نے اس کی بڑی آؤ

بھگت کی اور شہر سیری کی ایک حویلی میں اسے ٹھہرایا۔ اس کے مستقل قیام کے لیے یہ حکم دیا کہ شہر میں ایک نیا محل تعمیر کیا جائے جب غیاث الدین محمد عباسی کو اس کا پتا چلا، تو بڑا جز بز ہوا اور غیض وغضب سے مغلوب ہو کر اسی وقت قصر سلطان میں (جو شہر جہانِ پناہ میں تھا) پہنچا۔ قصر کے باہر اس فرش (بساط) پر جو اس کے لیے بچھایا جاتا تھا، براجمان ہوا اور اندر جانے کے بجائے وزیر سلطنت کو بلا بھیجا اور اس سے کہا کہ ''جا کر خداوند عالم (سلطان) سے کہہ دو کہ انھوں نے مجھے جو مال واسباب دیئے ہیں، وہ سب میرے پاس محفوظ ہیں، ان میں ایک حبہ کی بھی کمی نہیں ہوئی ہے، بلکہ کچھ اضافہ ہی ہوا ہے اور اس میں ''بڑھوتی'' ہی ہوئی ہے (اس شبہہ کو تقویت پہنچتی ہے کہ یہ چشم وچراغ خانوادۂ عباسیاں، کہ اسلام کے فریادرس، ملجاو ماوا یعنی غیاث الدین کے لقب سے ملقب تھے، کیا سودی کاروبار بھی کرتے تھے کہ اس میں ''بڑھوتی'' اور رباء کی کافی گنجائش پائی جاتی ہے) سلطان سے جا کر کہہ دو کہ ''اب میں تم لوگوں کے ساتھ نہیں رہ سکتا'' یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور واپس چلا گیا۔ اس پر وزیر کو بڑی حیرت ہوئی۔ اس نے وہاں موجود افسروں سے عباسی کی برہمی وخفگی کا سبب دریافت کیا۔ لوگوں نے کہا کہ سلطان نے شہر سیری میں بادشاہ غزنہ کے لیے محل تعمیر کرنے کا جو حکم دیا ہے، اس پر غیاث الدین محمد عباسی سخت برہم ہے۔ وزیر نے سلطان کی خدمت میں باریاب ہو کر اس ڈرامائی صورت حال سے اسے آگاہ کیا (اب قاری کو انتظار ہوگا کہ سلطان شعلۂ جوالہ کی طرح بھڑک اٹھا ہوگا' جلادوں کو حکم دیا ہوگا کہ بدبخت عباسی کو پکڑ کر قصر شاہی میں لائیں، اس کا سر قلم کریں اور کھال کھینچ کر اس میں بھس بھر دیں، پھر اس نشان عبرت کو تمام ممالک محروسہ میں تشہیر کی غرض سے گشت کرائیں۔ اس کے بعد اسے عراق، ایران، خراسان وماوراء النہر نشان امتیاز کے بطور روانہ کریں، تاکہ سلطان کے جاہ وجلال سے وہاں کی سرزمین تھرا جائے اور آسمان لرزہ براندام ہو جائے۔ ''لعنت خدا'' ہولاکو کی اولاد جو 'ایل خانیوں' کے نام سے عراق وایران میں اورنگ آرائے سلطنت ہے، یہ دیکھ کر شرم سے پانی پانی ہو جائے کہ ان کے پرکھے ہولاکو نے غیاث الدین محمد عباسی کے دادا مستعصم باللہ کے ساتھ کیوں نہ ایسا ہی سلوک کیا اور

کیوں اسے انگشت نمائے خلق کرنے کی غرض سے اس کی لاش میں بھس نہ بھرا اور اسے گشت نہ کرایا۔ مگر ہمارے قاری کو اس طرح کی سزا کا کوئی ذکر کتب تاریخ میں نہ ملے گا اور سلطان کے ردعمل اور عمل سے اسے تعجب انگیز مایوسی ہوگی، کیونکہ اس موقع پر جس طرز عمل کا اس نے اظہار کیا وہ اس کے کردار سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلطان جلال الدین فیروز خلجی یا سلطان فیروز شاہ کی جمالی کیفیت سلطان محمد بن تغلق کے جلال پر غالب آ گئی ہے اور گرگ خوں آشام بچۂ برہ کے حضور دم ہلا رہا ہے۔

سلطان نے وزیر سے عباسی کی برہمی کا سنتے ہی دس (۱۰) عماید کے ہمراہ جن میں امیر کبیر ملک قبولہ بھی تھا، قصر سلطان سے نکلا اور گھوڑے پر سوار ہو کر شہر سیری میں عباسی کے محل کے دروازہ پر جا پہنچا۔ محل کے باہر عام آدمیوں کی طرح گھوڑے سے اترا، اندر آنے کی اجازت طلب کی اور اجازت ملنے پر محل میں عباسی کے پاس گیا۔ سلطان نے عباسی سے ''تقصیر'' کی معافی مانگی، خیر ردوکد کے بعد عباسی کی خفگی، رضامندی میں بدل گئی لیکن سلطان نے اصرار کیا کہ جب تک ''مخدوم زادہ'' اپنا پاؤں میری گردن پر نہ رکھیں گے، مجھے یہ یقین نہ آئے گا کہ آنجناب نے مجھے معاف کر دیا ہے اور مجھ سے راضی ہو گئے ہیں۔ عباسی نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ آخر بڑے اصرار اور خوشامد کے بعد (پتا نہیں عباسی راضی ہوا یا اس کی مرضی کے خلاف زبردستی) امیر کبیر ملک قبولہ نے اس کا پاؤں اٹھا کر سلطان کی گردن پر رکھ دیا جو عباسی کے حضور سر بسجود تھا۔ اس پر سلطان نے خوش ہو کر کہا کہ ''اب مجھے یہ یقین ہو گیا ہے آنجناب مجھ سے راضی ہو گئے ہیں اور مجھے معاف کر دیا ہے''۔ ابن بطوطہ نے اس ڈرامہ کو ان الفاظ پر ختم کیا ہے کہ میں نے کسی کو اس طرح کی (چھچھوری) حرکت کرتے نہ دیکھا، نہ سنا ہے۔ اس سارے واقعہ پر کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد سوم کے مدون نے یہ پھبتی کسی ہے کہ ''ایک اونچے خاندان کے گداگر کے حق میں سلطان کی یہ فضول خرچی اور غلط بخشی ایسی ہی ہے کہ اسے عقل سلیم و ہوش و خرد سے کسی طرح کی مطابقت نہیں دی جا سکتی'' [۱۴]

مصر کے عباسی خلفاء کی تعظیم وتکریم اور خاندان عباسی کے ایک فرد کی اس عزت افزائی کا ایک ہلکا سا خاکہ پیش کرنے کے بعد ہم مصر میں ''ممالیک'' کی نگرانی بلکہ ''تولیت'' میں قائم ہونے والی نام نہاد ''خلافت'' کے احوال وآثار کا ایک اجمالی تعارف کرائیں گے، تاکہ ''سلطان الہند'' کی ان کی قدم بوسی وتکریم کو صحیح تناظر میں دیکھا جاسکے۔

بنوعباس کی ''خلافت'' ۱۳۲ھ (۷۵۰ء) میں قائم ہوئی اور ۶۵۶ھ (۱۲۵۸ء) تک سوا پانچ سو سال قوت وضعف کے مختلف مراحل سے گزر کر چنگیز خاں کے پوتے ہولاکو خاں کے ہلاکت بداماں منگولی غول بیابانی کے ہاتھوں شکست وریخت کا شکار ہوکر گرد وغبار کی طرح طوفان آتش وخون کی بھینٹ چڑھ گئی۔

خلافت عباسیہ کی اس طویل ترین مدتِ حکومت سے، کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ ان کے سینتیس (۳۷) خلفاء جو یکے بعد دیگرے مسندِ نشین خلافت ہوئے، ہمہ مقتدر تھے، اعلیٰ عسکری وانتظامی صلاحیتوں کے مالک تھے اور انھوں نے کشور کشائی کی تاریخ میں لافانی نقوش بطور یادگار چھوڑے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے اقتدار واقعی کا زمانہ ۱۳۲ھ (۷۵۰ء) سے ۲۴۷ھ (۸۶۱ء) تک ہے اور اس مدت میں وہ بااختیار اور امر وناہی تھے۔ اس دور میں دس (۱۰) خلفاء اورنگ آرائے حکومت ہوئے اور ان میں بھی اعلیٰ حربی وانتظامی صلاحیتوں کے حامل صرف پانچ خلفاء تھے یعنی المنصور، المہدی، الہارون، المامون اور المعتصم باللہ۔ المتوکل کے ۲۴۷ھ (۸۶۱ء) میں قتل کے بعد اگرچہ خلافتِ عباسیہ چار سو سال کے قریب قائم رہی اور ان کے ستائیس (۲۷) مدعیانِ خلافت بساط سیاست پر شاہ شطرنج کی طرح نمودار ہوئے اور پٹتے رہے، ان کی حیثیت مہروں سے زیادہ نہ تھی، کبھی ترک غلاموں کی سرکشی کے سامنے وہ بے دست وپا تھے، کبھی بویہی امراء کے اسیر تھے، کبھی سلاجقہ، بزرگ کے مہرے اور کبھی خوارزم شاہیہ کی ہیبت سے لرزہ براندام رہے۔ ھولاکو نے ۶۵۶ھ (۱۲۵۸ء) میں جس عباسی خلافت کو تہس نہس کیا وہ مسندِ مشیخت سے زیادہ نہ تھی۔ اور جس خلیفہ کی خلافت کا انھوں نے خاتمہ کیا اور اسے ہلاک کیا وہ ایک

خانقاہ کے پیر بوریا نشین کے سوا کچھ اور نہ تھا۔ ایک ایسی خلافت جیسی کہ بنو عباس کی تھی، جس کی عمر ایک سو سال سے کچھ ہی اوپر تھی، حیرت ہے کہ وہ بے اقتداری، بے صلاحیتی اور بے بسی کی اعصاب شکن کیفیات میں کس طرح مزید چار سو سال تک کڑیاں جھیلتی رہی اور اس عہد کے کسی مسلمان سلطان نے جن میں عضد الدولہ بویہی، سیف الدولہ حمدان، محمود غزنوی، طغرل سلجوقی، الپ ارسلان سلجوقی، اور ملک شاہ سلجوقی جیسے عظیم کشور کشا اور کشور آرا موجود تھے اس کے برائے نام وجود کو نہ مٹا سکے، اس کے آستانۂ خلافت پر قبضہ نہ کر سکے اور اسی بے اختیار خلافت سے پروانۂ حکومت، سند حاکمیت اور لوائے امتیاز حاصل کرتے رہے۔ یہ قیاس کرنا محض خوش فہمی نہیں ہے کہ اگر کافر ہولاگو کے کافر منگول خوں خوار بھیڑیئے بغداد پر ٹوٹ نہ پڑتے، خاندان خلافت کو برباد نہ کر دیتے اور شہر امن وسلامتی (مدینۃ السلام) کی اینٹ سے اینٹ نہ بجا دیتے تو خلافت عباسی جیسا کہ داؤد علی بن عباسی نے کوفہ کے منبر سے اعلان کیا تھا، قائم رہتی اور قرب قیامت پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جائزہ حکومت دیتی[۱۵]

تاریخ کا طالب علم بے اقتداری اور انتشار کے باوجود خلافت عباسیہ کے طویل عرصہ تک استقرار و استمرار کا سبب جاننا چاہے گا۔ ہم سطور آیندہ میں اختصار کے ساتھ ان عوامل کا ذکر کریں گے جن کی وجہ سے بنو عباس کی خلافت باقی رہی اور کسی مسلمان فاتح نے اسے فتح کرنے کی ہمت نہ کی یہاں تک کہ ایک کافر، تہذیب وتمدن نے ناآشنا حکمران کی انسانیت دشمن گرگ صفت سپاہ نے اس برائے نام خلافت کا گلہ گھونٹ دیا۔ کاش وہ یہ سوچتے کہ انھوں نے ایک اسرۂ حاکمہ کا خاتمہ نہیں کیا بلکہ تہذیب وثقافت کے مینارۂ نور کو ڈھا دیا، ایک کمزور خلیفہ کو ہلاک نہیں کیا بلکہ علم وآگہی، انسانیت وشرافت کے ایک نشان بلند کو زمین بوس کر دیا اور اسلام کے اتحاد کو میٹ دیا۔

دعوتِ عباسیہ (عباسی تحریک) بنیادی طور پر ایک شیعی مذہبی وسیاسی تحریک تھی۔ اہل تشیع کے فرقہ کیسانیہ سے اس کا تعلق تھا۔ تمام شیعی تحریکیں ''اہل بیت'' رسول ﷺ کی تقدیس کی قائل

ہیں، امامت وخلافت کو نبوت و رسالت کی طرح عطیہ الٰہی سمجھتی ہیں اور یہ عقیدہ رکھتی ہیں کہ امام وخلیفۂ منصوص من اللہ ہوتا ہے۔ جس کے نصب وعزل میں بندوں کا کسی طرح کا عمل دخل نہیں ہوتا۔ چنانچہ حضرت علیؓ وصی رسولؐ تھے اور رسول مکرم علیہ الصلوۃ والسلام کے بعد وہی اہل ایمان کے امام برحق، اہل اسلام کے امیر اور رسول برحق علیہ السلام کے جانشین وخلیفۂ تھے۔ ان کے پیش رو آئمہ وخلفاء اہل تشیع کے عقیدہ کے مطابق غاصب ومتغلب تھے۔ ابتداءً امامت وخلافت کو حضرتِ علیؓ کی فاطمی اولاد امجاد میں محدود کیا گیا۔ مگر جب مختار ابن ابی عبید ثقفی نے ۶۶ھ میں کوفہ میں حکومت کے خلاف خروج کیا اور عراق کے ایک حصہ پر قبضہ کرلیا تو اس نے ''اہل بیت رسول'' کے سربرآوردہ فرد جناب علی بن حسین بن علی المعروف بہ زین العابدین کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی، لیکن بوجوہ اسے اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ چنانچہ چالاک مختار نے نظریۂ ضرورت کے تحت حضرت علیؓ کے غیر فاطمی بیٹے محمد ابن الحنفیہ سے رجوع کیا اور ان کی امامت کا اعلان کردیا۔ یوں امامت وخلافت کا دائرہ وسیع ہوگیا اور تمام اولادِ علیؓ، فاطمیؓ اور غیر فاطمیؓ مستحق امامت وخلافت ٹھہری مختار ثقفی کے قائم کردہ اس شیعہ فرقہ کو مختاریہ، کیسانیہ اور ہاشمیہ کے ناموں سے موسوم کیا گیا۔

محمد بن حنفیہ کے ۸۰ھ میں انتقال کے بعد فرقہ کیسانیہ کی امامت ان کے بیٹے ابو ہاشم کے حصہ میں آئی۔ کہا جاتا ہے کہ ۹۹ھ میں دمشق سے لوٹتے وقت ابو ہاشم نے حمیمہ کے مقام پر جہاں بنو عباس کے کچھ خاندان سکونت رکھتے تھے، انتقال کیا اور اپنے بعد بنو عباس کے ایک شخص محمد بن علی بن عبداللہ عباس بن عبدالمطلب کو اپنا جانشین مقرر کردیا۔ یوں اہل بیت رسولؐ اور آل محمدؐ کی اصطلاح میں بنو عباس بھی داخل ہوگئے اور شیعی تحریکوں میں امامت بنو فاطمہؓ، آل علیؓ، اور آل عباسؓ، کے حامی شامل کرلئے گئے، حضرت عباس بن عبدالمطلبؓ رسول اکرم علیہ السلام کے چچا تھے اور فتح مکہ سے کچھ ہی پہلے اسلام لائے تھے، اس لیے نہ ان کا شمار مہاجرین اولین میں تھا اور نہ انھیں قدیم الاسلام صحابہ کرام میں کوئی مقام دیا گیا۔ حضرت علیؓ السابقون الاولون میں تھے انھیں

ابتدائی اسلام لانے والوں اور ابتدائی ہجرت کرنے والوں میں امتیازی حیثیت حاصل تھی، ان کی فدائیت، خدمت اسلام اور شرف مصاہرت (دامادی رسولؐ) نے انھیں صحابہ کرام میں نمایاں مقام عطا کیا تھا، وہ عشرہ مبشرہ میں شامل تھے اور رسول اکرم علیہ السلام کے چوتھے جانشین اور خلیفہ راشد تھے۔ ان کے اس شرف کے سبب اور ان کے دو بڑے صاحبزادوں جناب حسن و جناب حسینؓ کے فرزندانِ جگر گوشئہ رسولؐ حضرت فاطمہؓ ہونے کے سبب اولادِ علیؓ کو اسلامی اشرافیہ میں امتیازی مقام حاصل تھا، بنو عباس کو ان حضرات کے مقابلہ میں کوئی اہمیت نہیں دی گئی، اس لیے محمد بن علی بن عبداللہ کے منصب امامت پر فائز ہونے سے انھیں کوئی بڑا مقام نہ مل سکتا تھا۔ اس حقیقت کا محمد بن علی کو بخوبی علم تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بنو عباس کے دعویٰ امامت کی کوئی عوامی پذیرائی نہ ہوگی، اس لیے فرقہ کیسانیہ، مختاریہ یا ہاشمیہ کے اس نئے امام محمد بن علی نے اپنی امامت کی دعوت دینے کی بجائے صرف امامت آلِ محمدؐ کا پروپگنڈا شروع کیا۔ خانوادۂ علویؓ کے افراد اور ان کے شیعہ اس تحریک سے وابستہ ہوگئے کیونکہ وہ آلِ محمدؐ کے مفہوم میں صرف حضرت علیؓ کی فاطمیؓ اولاد کو داخل سمجھتے تھے۔

یہ بات ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ بنو عباس در پردہ اپنی امامت کی راہ ہموار کر رہے اور انھیں فریب دے رہے ہیں۔ جب یہ تحریک کامیابی سے ہم کنار ہوئی اور کوفہ میں ۱۳۲ھ میں ابوالعباس عبداللہ محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس بن عبدالمطلب کی بیعتِ خلافت و امامت ہوئی اور اس نے ''السفاح'' کے بارعب لقب سے اپنے خاندان کی خلافت کا آغاز کیا، تو آلِ علی حیران و ششدر ہوگئے اور اپنی ''سادگی'' اور حریف کی ''عیاری'' پر دل مسوس کر رہ گئے۔ دوسرے عباسی خلیفہ ابوجعفر المنصور (۱۳۶ تا ۱۵۸ھ) کے دور سے علویوں نے عباسیوں کے خلاف موقع بے موقع خروج کیا اور بنو امیہ سے زیادہ، بنو عباس کے عہد میں جور و ستم اور قتل و قید کے مظالم جھیلے۔ ان واقعات کی تفصیل میں جا کر ہم اپنے موضوع سے دور ہٹنا نہیں چاہتے، اس لیے ذکر کو یہیں ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ ہم نے ایک طویل مضمون بعنوان ''علویوں اور عباسیوں

کے تعلقات پر ایک نظر'' میں اس بحث کو پھیلایا ہے۔ قاری کو اس کے مطالعہ کا مشورہ دیا جاتا ہے[۱۶]

جب ۱۰۰ھ میں محمد بن علی عباسی نے اپنی دعوت کا سلسلہ شروع کیا اور خلافت اسلامیہ کے مشرقی علاقوں (خراسان وماورالنہرو وبحستان) میں اپنے داعی بھیجے تو انھیں صرف ''آل محمدؑ'' کی امامت کی دعوت کی ہدایت کی اور بنو عباس کی دعوت، امامت وخلافت سے، جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، عمداً احتراز کیا۔ مگر جیسے ہی مشرقی صوبوں پر ابو مسلم خراسانی کا قبضہ ہو گیا اور عراق کے گورنر ابن ہبیر ہ، کو شکست ہوئی اور وہ واسط میں قلعہ بند ہو گیا، تو اب اس اخفاء اور احتیاط کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اسی لیے جب کوفہ کی جامع مسجد سے ابو العباس عبداللہ بن محمد عباسی کی خلافت کا اعلان کیا گیا اور لوگوں کو اس کی بیعت کی دعوت دی گئی تو ہر چند کے اسے تیز بخار چڑھا ہوا تھا، اس نے من جملہ دیگر امور سے اپنے خطبہ خلافت میں یہ بھی کہا:۔

''تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے ہمارے لیے اسلام کو پسند کیا۔ اور اسے ہم سے قوی دست کیا، ہمیں اس کی پناہ گاہ بنایا اور اپنے رسول کی قرابت داری کے شرف سے ہمیں مشرف کیا۔ ہمیں ان کے خاندان میں پیدا کیا اور اہل اسلام میں ہمیں بلند مرتبہ عطاء کیا اور ہماری مودّت ان پر فرض کی (اس کی دلیل کے بطور سفاح نے قرآن کی تین آیتیں سورۃ الاحزاب، آیت ۳۳، الشوریٰ، آیت ۲۳، الشعراء آیت ۲۱۴ پڑھیں) یہ گمراہ سبائی (شیعہ) یہ گمان فاسد رکھتے ہیں کہ امامت، ریاست اور سیاست کا ہم سے زیادہ حق دار کوئی اور ہے (اشارہ علویوں کی جانب تھا) حالانکہ ہماری بدولت لوگوں کو گمراہی کے بعد ہدایت ملی، باطل کا قلع قمع ہوا اور جو فساد در آیا تھا، اللہ نے ہمارے ذریعہ سے اس کی اصلاح کی اور اسے درست کیا''۔

ابو العباس السفاح بخار کی شدت کے سبب اس سے زیادہ نہ بول سکا اور منبر سے اتر آیا۔ اس کا چچا داؤد بن علی جو منبر پر اس سے ایک زینہ نیچے کھڑا تھا۔ اس نے اس کی ادھوری تقریر کو مکمل کیا۔ اس نے حاضرین سے یوں خطاب کیا:۔

''اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہمارے دشمن (بنوامیہ) کو ہلاک کر دیا اور ہمارے نبی ﷺ کی جو میراث تھی اسے ہم تک پہنچا دیا.......لوگو! اب ہمارے نبی کے ''اہل بیت'' کی جانب حق (خلافت) لوٹ آیا ہے.......اے اہلِ کوفہ! اللہ کی قسم ہم ایک عرصہ سے مظلوم تھے اور ہم سے ہمارا حق (خلافت وامامت) زبردستی چھین لیا گیا تھا...... جب خراسان سے ہمارے حامی (شیعان بنوعباس) آئے تو ہمارا حق زندہ اور بحال ہو، ہماری حجت برومند ہوئی ان لوگوں کی بدولت ہمیں اقتدار وغلبہ حاصل ہوا۔ ہمیں جس کا انتظار تھا وہ ظاہر وباہر ہو گیا اور اللہ نے اسے کر دکھایا.......مقام شکر ہے کہ اللہ نے بنوہاشم کو منصب خلافت پر فائز کیا اور ہم سرخرو ہوئے...... لوگو! جناب رسول ﷺ کے بعد جو لوگ برسرِ منبر آئے ان میں حضرت علیؓ اور (السفاح کی جانب اشارہ کرتے ہوئے) اس امام وخلیفہ کے سوا کوئی برسرِ حق اور جائز امام وخلیفہ نہ تھا......لوگو! تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ امر (یعنی امامت وخلافت) اب ہمارے خاندان سے باہر نہ جائے گا اور ہم قیامت کے قریب حضرت عیسیٰؑ کو اس کا جائزہ دیں گے'' [۱۷]

السفاح کے مذکورۂ بالا خطبہ اور داؤد بن علی کے تکملہ سے جن عقاید کا پتا چلتا ہے وہ خالص شیعی ہیں۔ ان دونوں نے یہ بات بڑے دھڑلے سے دہرائی ہے کہ امامت وخلافت آل عباس کا حق ہے اور اسلام کے پہلے تین خلفاء راشدون غاصب ومتغلب تھے۔ اس خطبہ اور اس کی تکملہ میں ''اہل بیت'' کے اسلام اور اہل اسلام پر احسان کا بھی ذکر کیا گیا ہے اور آیات قرآنی کی رو سے ان کی محبت ومودت کو مسلمان پر فرض قرار دیا گیا ہے۔ ان دونوں چچا بھتیجے نے اپنی مظلومیت کا بھی ذکر کیا ہے، لیکن تاریخ نے عہد خلفاء راشدون اور عہد اموی میں ان پر کسی ظلم کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ مسند خلافت پر متمکن ہونے سے پہلے بنوعباس کو کوئی اہمیت حاصل نہیں تھی اور ان کے بزرگوں نے خلفاء راشدون اور تمام اموی خلفاء کی بیعت خلافت کی تھی اور خلافت کو میراث رسول قرار دیکر اس پر انھوں نے کسی طرح کا دعویٰ بھی نہیں کیا تھا۔ اس خطبہ اور اس کی تکملہ کی رو سے امامت وخلافت میراث رسول تھی اور چونکہ رسول اکرم ﷺ کے وصال

کے وقت آپؐ کے واحد زندہ چچا عباسیوں کے جداعلیٰ جناب عباسؓ آپ کے وارث تھے اس لیے یہ میراث انھیں ملی اوران سے اولادعباس کووراثۃً یہ منصب منتقل ہوا۔ حضرت علیؓ چونکہ آنحضرتؐ کے چچازاد بھائی تھے اس لیے چچا کے ہوتے انھیں میراث نہیں مل سکتی تھی۔ مزید یہ کہ حضرت فاطمہؓ بیٹی تھیں اور بیٹی ''عصبہ'' نہیں ہوتی اس لیے وہ بھی اس میراث کی حق دار نہ تھیں اور حضرت حسن وحسین بیٹی کی اولاد ہونے کے ناطے، میراث نبوی کے وارث نہیں ہوسکتے تھے اسی لیے امامتِ آلِ علیؓ کے قائل لوگ جنھیں وہ سبائیہ کہتا ہے، گمراہ اور برسرغلط ہیں۔

ابوالعباس السفاح نے اپنے خطبہ میں قرآن مجید کی تین آیتیں بھی تلاوت کیں اوران سے اہل بیت کی پاکی، طہارت وبراءت پر استدلال کیا ہے۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ السفاح کی یہ کوشش قرآن مجید کی معنوی تحریف ہے کیونکہ پہلی آیت جو سوۃ االاحزاب کی تینتیسویں (۳۳) آیت ہے وہ ازواج مطہرات کے بارے میں نازل ہوئی ہے اس آیت کو پہلی اور بعد کی آیتوں کے سیاق وسباق میں دیکھا جائے تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے۔ ان آیات میں ''یانساء النبی'' کہہ کران سے بار بار خطاب کیا گیا ہے یہ آیت تطہیرازدواج مطہرات کی علو ئے قدر اور پاکی کے بیان میں ہے۔ دوسری آیت سورۃ الشوریٰ کی تئیسویں (۲۳) آیت ہے، وہ مکی سورہ ہے اوراس میں کفارقریش سے خطاب کر کے فرمایا گیا ہے کہ ''اے نبی ان کفارقریش سے کہہ دو کے میں تبلیغ رسالت کی کوئی اجرت اور مزدوری نہیں مانگتا، مگر رشتہ ناطے کی مودت تو قائم رکھو''۔ اگراس آیت کا یہ مفہوم لیا جائے کہ ''اے مسلمانوں میں تم سے اس تبلیغ ورسالت کا کوئی اجر نہیں مانگتا مگر اپنے قرابت داروں کی محبت ومودت''۔ تو خاکم بدہن شان رسالت اور مقصد تبلیغ پر اس سے سخت ضرب لگے گی یعنی رسول اکرم علیہ السلام کی بعثت اورر سالت کا مقصد صرف یہ تھا کہ لوگ خاندانِ نبوت سے محبت کریں، پھر خاندان نبوت کا آغاز کس نام سے کریں، حضرت ابراہیمؑ کے اسم گرامی سے، عدنان کے نام سے، قریش کے نام سے، قصی کے نام سے، عبدمناف کے نام سے، ہاشم کے نام سے، عبدالمطلب کے نام سے یا عبداللہ کے نام سے وغیرہ وغیرہ؟ اس طرح سے اہل

اسلام پر ابولہب کی محبت بھی فرض ہوگی کہ وہ آنحضرت ﷺ کا چچا اور قربت دار تھا، ابولہب کے دو بیٹے عتبہ وعتیبہ بھی واجب المودت قرار پائیں گے حالانکہ ان بدبختوں نے رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دو صاحب زادیوں کو طلاق دیدیا تھا۔ ایک بات اور بھی ہے کہ اس سورہ کے نزول کے وقت السفاح کے جدامجد جناب عباس تو مسلمان بھی نہ ہوئے تھے۔ تیسری قرآنی آیت جو السفاح نے اقرباء نبیؐ کے امتیاز کے لیے پڑھی تھی وہ سورۂ الشعراء کی ایک سو چودھویں (۱۱۴) آیت ہے جس میں آنحضرت ﷺ کو یہ حکیم دیا گیا ہے کہ ''آپ اپنے قریبی رشتہ داروں کو عذاب الٰہی سے ڈرائیں اور انھیں اسلام کی دعوت دیں۔'' یہ سورہ بھی مکی سورتوں میں ہے اور ابتدائی سورتوں میں شمار ہوتی ہے اس کا ذکر سیرت وحدیث کی بیشتر کتابوں میں ملتا ہے، چنانچہ آپؐ نے تمام بنو عبد مناف کو جن میں بنوامیہ بھی شامل ہیں اپنے ہاں مدعو کیا اور انھیں اسلام کا پیغام دیا، ابولہب نے اس مجلس کو درہم برہم کردیا اور سب لوگ جن میں السفاح کے جدامجد عباسؓ بھی تھے، اٹھ کر چلے گئے۔ اس آیت قرآنی سے اگر کوئی بات واضح ہوتی ہے تو یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی دعوت پر عباسیوں کے مورث اعلیٰ بلکہ حضرت علیؓ کے سوا کہ وہ بھی کم عمر لڑکے تھے، بنو ہاشم کے کسی شخص نے اسلام کی آواز پر لبیک نہ کہا۔ یہ بات مناقب کے بجائے مثالب کے زیل میں آتی ہے۔[۱۸]

جب عباسیوں اور علویوں میں اقتدار حکومت کی کش مکش شروع ہوئی، تو عباسی خلفاء نے بڑی پرکاری سے اپنے پہلے موقف سے ہٹ کر ایک دوسرا موقف اختیار کیا۔ دوسرا عباسی امام وخلیفہ ابوجعفر المنصور باللہ (۱۵۸۔۱۳۶) اس نئی حکمت عملی کا واضع ہے۔ محمد بن عبداللہ بن حسن بن حسن بن علی بن ابی طالب ذوالنفس الزکیہ نے جب ۱۴۵ھ میں مدینہ میں اپنی خلافت کا اعلان کیا، تو المنصور نے جہاں اس کے تدارک کے لیے عسکری تیاریاں کیں، وہیں سیاسی حربے بھی استعمال کیے۔ فریقین کے درمیان جو خطوط کے تبادلے ہوئے، ان میں المنصور نے اپنے پیش رو السفاح کی روش سے ہٹ کر جو مسلک اختیار کیا، وہ اہل تشیع کے مسلک سے مختلف تھا۔ ان مکتوبات کے

مطالعہ سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عباسی اپنے سابق موقف سے ہٹ رہے ہیں۔اب ان کے نزدیک رسول اکرم ﷺ اور حضرت علیؓ کے درمیانی عرصہ میں امام وخلیفہ کے منصب پر فائز ہونے والے تین اصحاب یعنی سیدنا ابوبکر صدیق، سیدنا عمر فاروق اور سیدنا عثمان غنیؓ غاصب ومتغلب نہ تھے، بلکہ ان کے تعامل کو حجت قرار دے کر اپنے مخالف (ذوالنفس الزکیہ) کے خلاف دلیل قائم کی گئی تھی۔یوں دعوت عباسیہ کی شیعی اساس کو نظر انداز کر کے اہل سنت و جماعت کی جانب اس کا جھکاؤ شروع ہوا۔المنصور نے ذوالنفس الزکیہ کے مکتوب کے جواب میں جو خط تحریر کیا،اس کے بعض فقروں پر غور کرنا چاہیے:۔

''جب حضرت محمد ﷺ مبعوث ہوئے تو آپؐ کے چار چچا بقید حیات تھے۔ان میں سے دو (حمزہ وعباس) نے آپؐ کی دعوت کو قبول کیا اور اسلام لائے اور دو (ابوطالب وابولہب) نے اس دعوت کو قبول نہ کیا۔دو اسلام لانے والوں میں ایک میرے جدامجد تھے (یعنی عباس) اور دو اسلام نہ لانے والوں میں ایک تمھارے جد تھے (یعنی ابوطالب)۔سوان اسلام نہ لانے والے چچاؤں کا رسول اکرمؐ سے تعلق ختم ہوگیا اور وہ نبیؐ کی میراث کے حق دار نہ رہے۔رسول اکرم کے وصال کے وقت آپ کے صرف ایک چچا عباس زندہ تھے چنانچہ نبی کی میراث (خلافت) انھیں کے حصہ میں آئی اور ان سے ان کی اولاد کو یہ میراث منتقل ہوئی۔تمھارے باپ علیؓ نے اس میراث (خلافت) کا دعویٰ کیا مگر مسلمانوں نے ان کی بجائے یہ منصب ابوبکرؓ کو اور ان کے بعد عمرؓ کو تفویض کیا۔اور علیؓ کو اس سے محروم رکھا۔عبدالرحمٰن بن عوف نے تمھارے باپ کے بجائے عثمان غنیؓ کو خلافت سونپ دی، جب عثمانؓ قتل ہوئے تو ان کے قتل کی تہمت علیؓ پر لگائی گئی۔طلحہؓ وزبیرؓ نے ان سے جنگ کی اور سعدؓ بن ابی وقاص نے ان کی بیعت نہ کی اور اپنا دروازہ بند کر لیا۔تمھیں اپنے باپ علیؓ کے سابق الایمان ہونے پر بڑا ناز ہے مگر نبی کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم نے اپنی آخری علالت میں ان کو مسلمانوں کی صلوۃ کا امام نہیں بنایا بلکہ ان کے بجائے ابوبکرؓ کو یہ خدمت تفویض کی۔اگر تم لوگوں کا امامت میں کوئی حق بھی تھا تو اس کو تمھارے باپ حسنؓ نے چند سکوں کے عوض

معاویہؓ کے ہاتھ بیچ دیا اور اپنے شیعوں کو بے یار و مددگار چھوڑ کر حجاز چلے گئے۔ پھر تمھارے چچا حسینؓ نے ابن مرجانہ (عبیداللہ بن زیاد، والئی کوفہ) کے خلاف خروج کیا، لوگوں نے ان کا ساتھ نہ دیا وہ مارے گئے اور ان کا سر نیزے پر علم کرکے اس کے سامنے کوفہ لایا گیا۔ اس کے بعد تم نے بنی امیہ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا (زید بن علی بن حسین کے خروج کی جانب اشارہ ہے) کہ انھوں نے تمھیں قتل کیا سولی پر لٹکایا اور جلا دیا (اشارہ ہے یحییٰ بن زید کے قتل کی طرف))''[۱۹]

المنصور کے اس خط اور آل حسنؓ پر اس کے مظالم کے ساتھ ہی علویوں اور عباسیوں کے راستے الگ ہوگئے اور سیاسی مصلحتوں کے تحت عباسی خلفاء نے اہل سنت کی جنبہ داری شروع کی۔ المہدی (۶۹۔۱۵۸ھ) سے اس نئی حکمت عملی کا آغاز کیا۔ الہارون (۹۳۔۱۷۰ھ) کے دور میں علویوں کی تعذیب اور حکومت کی ''سنیت'' میں تشدد پیدا ہوا۔ المامون (۲۱۸۔۱۹۸ھ) نے اس حکمت عملی سے انحراف کیا، شیعوں کے امام علی الرضاء کو اپنا ولی عہد مقرر کیا اور عباسی ''شعار'' کو جو سیاہ تھا علویوں کے سبز شعار سے بدل دیا مگر اس کے اس اقدام کی بغداد میں سخت مخالفت ہوئی اور مامون کو معزول کرکے اس کے چچا ابراہیم بن مہدی کو خلیفہ چن لیا گیا۔ مامون نے اپنی روش کو ترک کردیا تب جاکر بغداد پر اس کا اقتدار قائم ہوسکا۔ شیعہ مخالف اقدام المتوکل (۴۷۔۲۳۲ھ) کے دور میں بہت شدید ہوگیا، اسے ''حامی السنۃ'' کا لقب دیا گیا۔ المتوکل نے حضرت حسینؓ کے مزار کو زمین دوز کروادیا، ارد گرد کی عمارتوں کو منہدم کروادیا اور اس میں باقاعدہ کاشت کاری کا سلسلہ شروع کرادیا۔ اس کے بعد جب تشیع و تسنن میں محاذ آرائی شروع ہوئی وہ خلافت عباسیہ کے انقراض تک کبھی شدت سے اور کبھی سست روی سے جاری رہی[۲۰]

اسلامی علوم وفنون کی ضابطہ بندی، تدوین وتالیف کا باقاعدہ آغاز خلفاء عباسیہ کے عہد سے ہوا۔ المنصور کی سرپرستی میں یہ سلسلہ شروع ہوا اور پانچویں صدی ہجری تک یہ عمل زور وشور سے جاری وساری رہا۔ کچھ درباری فضلاء نے حکومت وقت کی ایماء پر بنو عباس کی تقدس، تعظیم وتکریم سے متعلق احادیث واقوال مناقبانہ وضع کیے۔ بعض نے سیرت ومغازی پر لکھے ہوئے

جناب عباسؓ کے مناقب میں واقعات گھڑے، انھیں قدیم الاسلام قرار دیا اور اگر وہ کبھی مسلمانوں کے خلاف قریش کے جھتے میں آئے تو انھیں کفار کے جبر پر محمول کیا۔ جناب عباسؓ کے بیٹے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو 'حبر امت'' کا لقب دیا گیا۔ احادیث، احکام، مغازی، تفہیم قرآن اور عربی زبان وادب میں انھیں ''صغار صحابہؓ'' میں سب سے نمایاں ٹھہرایا گیا۔ ان کے تدبر واصابت رائے کے اثبات کی غرض سے سیدنا عمر فاروقؓ کو ان کے مشوروں پر عمل پیرا بتایا گیا۔ تاریخ میں جناب عباس اور جناب عبداللہ بن عباس کے ''ناکردہ'' کارناموں کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا۔ احادیث میں ان کی عظمت کی روایتیں ایزاد کی گئیں اور ''بنوعباس'' کو اہل بیت رسولؐ، ذالقربیٰ وآل محمدؐ ثابت کیا گیا۔ ان کے اقتدار کو مذہب کا حصار مہیا کیا گیا۔ انھیں وارث ونائب رسولؐ کہا گیا اور ان کی اطاعت کو اللہ اور اس کے مقدس نبیؐ کی اطاعت قرار دیا گیا۔ احکام ومسائل پر لکھنے والے علماء نے ان سے عمل کو محبت اور ان کے تعامل کو وجہ دین بنادیا۔ ۲۴۷ھ (۸۶۱ء) کے بعد عباسیوں کے رقبۂ خلافت میں قطع وبرید شروع ہوگئی، مقامی امراء اور بعض طالع آزماؤں نے اسے ''لوٹ کا مال'' سمجھ کر اس پر دست درازی شروع کردی۔ فقہاء مفکرین نے ان کے اقتدار کو جو بالفعل تھا، ناجائز ٹھہرایا اور انھیں الامیر بالاستیلاء اور متغلب خیال کیا، ان کے حیطۂ اقتدار میں اعمال دین کی ادائیگی مثلاً قیام جمعہ وعیدین کو نامشروع کہا اور عدالتی فیصلوں اور زندگی کے روزمرہ کے وظائف کو غیر اسلامی قرار دیا اور ان متبدین کے لیے یہ لازمی قرار دیا، کہ وہ خلفاء عباسیہ سے اپنی حکومتوں کے جواز کی سند میں جمعہ وعیدین کے خطبوں میں ان کا امام وخلیفہ کی حیثیت سے نام لیں، سکوں پر ان کے نام نقش کرائیں اور حکام وقضاۃ کے تقرر کی ان سے منظوری حاصل کریں۔ اس صورت میں انھیں امیر بالاستکفاء (جائز حکمراں) سمجھا جائے گا اور وہ خلیفہ عباسی کے نیابت میں امور سلطنت سرانجام دیں گے لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ امراء جن علاقوں پر قابض ومتصرف تھے، وہ امور سابق میں خلفائے عباسیہ کے قبضے میں تھے اور اگر ان میں کوئی نیا علاقہ شامل کیا گیا تھا، تو وہ بھی عباسیوں کی واضح ہدایت کے بعد فتح ہوا تھا۔ کوئی ایسا خطہ جس پر عباسیوں کا کبھی قبضہ

نہ رہا تھا، اس میں شامل نہ تھا[۲۱]

امام عبدالقاہر بغدادی نے ''اصول الدین'' میں قاضی ابوالحسن علی الماوردی نے ''الاحکام السلطانیہ'' میں اور قاضی ابویعلیٰ الفراء نے اسی نام کی اپنی تالیف میں ''امامت'' (خلافت) کو امتِ محمدیہ کے لیے ضروری قرار دیا ہے، اس پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہے اور اسے قائم کرنا احکام شرعیہ کے نفاذ کی غرض سے امت پر فرض کفایہ ہے۔ علامہ ابن خلدون نے خلافت (امامت) کی تعریف یوں کی ہے کہ ''وہ معاملات دین کی بجا آوری اور دین کے اصول کے مطابق دنیا کی سیاست کے نفاذ میں صاحب شریعت (ﷺ) کی نیابت اور جانشینی ہے۔ یوں امت کے لیے ضروری ہے کہ منصب امامت کو قائم کرے اور ایک امام وخلیفہ کی بیعت کرے تاکہ امور دین منضبط ہوں، احکام شرعیہ بجالائے جائیں اور دینوی امور ومعاملات کو دین کے مقررہ اصول وضوابط کے تحت سرانجام دیا جائے[۲۲] یہی وجہ تھی کہ جناب رسول اللہ ﷺ کے وصال کے فوراً بعد صحابہ کرامؓ نے نصب امام کی کوشش کی اور اجماع سے سیدنا ابوبکر صدیقؓ کو اپنا امام اور رسول مکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا خلیفہ مقرر کیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے نصب امام کا اہتمام کیا۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد کہ اسلامی دنیا، اضطراب کا شکار تھی اس نے جلد سے جلد سیدنا علی مرتضیٰؓ کو کثرت رائے سے اپنا امام اور خلیفہ منتخب کیا۔ خلفاء راشدون کے بعد عہد اموی میں ایک خلیفہ کی زندگی میں اس کے جانشین (ولی عہد) کی نامزدگی اس لیے بھی ضروری ٹھہرائی گئی تاکہ امت کسی انتشار کا شکار نہ ہو۔ اسلامی فکر پر لکھنے والوں نے اسی لیے ''عہد'' (ولی عہد) کو جائز قرار دیا۔ اس طور سے وصال نبویؐ کے بعد سے خلافت عباسیہ کے انقراض تک امت نے اس منصب کو باقی رکھا اور تیسری صدی ہجری اور اس کے بعد کے زمانوں میں جبکہ خلافت عباسی برائے نام رہ گئی تھی۔ منصبِ خلافت کو قائم رکھ کر ضروریات دین کی تکمیل اور اس ''فرض کفایہ'' کی تعمیل کی گئی۔ عہد عباسی کے زوال وانحطاط کے وقت بھی بے اختیار اور بے طاقت خلفاء ہی کو تمام دینی اور دینوی معاملات کا مختار ومجاز سمجھا گیا اور طاقت ور ہمہ مقتدر سلاطین

کو پابند کیا گیا کہ وہ عباس خلفاء سے سند حکومت حاصل کریں، ان کے نام کا خطبہ پڑھیں اور سکوں پر ان کے نام نقش کرائیں۔ سلطان محمود غزنوی جیسے فاتح، منتظم اور کشور آرا نے بھی اسی عباسی خلیفہ (القادر) سے سند حکومت حاصل کی اور یمین الدولہ وامین الملت کے خطابات پائے کہ اس کے بغیر عوام وخواص میں اس کی کوئی آئینی حیثیت نہ ہوتی۔ عظیم طغرل سلجوقی نے عباسی خلیفہ (القائم) سے سند حکومت اور رکن الدولہ ورکن الدین کے خطابات پائے اور مفتخر ہوا۔ اس طرح ہر بااقتدار سلطان عباسی خلیفہ سے سند حکومت لینے پر مجبور تھا اور اگر کسی نے عباسیوں سے یہ سند نہ لی تو اس کی حکومت بے اعتبار سمجھی جاتی تھی۔ اس کی مثال علاؤ الدین محمد خوارزم شاہ (۶۱۸۔۵۹۶ھ/ ۱۲۲۰ء۔۱۱۹۹) کی حکومت ہے۔ اس نے عباسی خلیفہ الناصر الدین اللہ (۶۲۲۔۵۷۵ھ/ ۱۲۲۵۔۱۱۷۹ء) کی مخالفت کی، اس پر فوج کشی کی مگر اس کی جمعیت پراگندہ اور اس کی سلطنت تہس نہس ہوگئی۔ عباسیوں کو جو نمایاں مقام حاصل تھا اس کا عشرِ عشیر بھی انھیں کے دور میں قائم ہونے والی مصر وافریقہ کی خلافت فاطمین (۵۶۷۔۲۹۷ھ/ ۱۱۷۱۔۹۰۹ء) اور اسپین کی خلافت امویہ (۴۲۲۔۳۰۰ھ/ ۱۰۳۱۔۹۱۲ء) کو نہ مل سکا اور ان کی خلافتوں کی حیثیت مقامی سلطنتوں سے زیادہ نہ سمجھی گئی[۲۳]

خلافت عباسیہ بغداد کی یہی مذہبی حیثیت تھی اور ریاست کے عوام وخواص میں اس کی یہی اہمیت تھی جس نے منگول سردار ہولاکو کے ہاتھوں آخری عباسی خلیفہ امیر المومنین المستعصم باللہ (۵۶۔۶۴۰ھ/ ۵۸۔۱۲۴۲ء) کی شہادت، خلافت کے سقوط اور مسلمانوں کی مرکزیت کے خاتمہ کے بعد بھی، ان کے اثر ورسوخ کو ختم نہ ہونے دیا۔ چنانچہ سلطنت دہلی میں غیاث الدین بلبن (۸۶۔۶۶۴ھ/ ۸۷۔۱۲۶۶ء) کے عہد تک اسی مظلوم عباسی خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا رہا[۲۴] بہر کیف خلافت عباسیہ کی نشاۃ ثانیہ کے لیے مصر وشام کے مملوک سلاطین نے پہل کی اور ۶۵۹ھ (۱۲۶۲ء) میں اس خاندان کے ایک فرد ابوالقاسم احمد کو مصر وشام کے مملوک سلطان الملک الظاہر بندقداری (۷۶۔۶۵۸ھ/ ۷۷۔۱۲۶۰ء) نے مسند خلافت پر متمکن کر کے مصر میں خلافت

عباسیہ قائم کردی۔ مصر وشام کے یہ عباسی خلفاء محض متبرک خلیفہ وامام تھے، ان کی کوئی سیاسی حیثیت نہ تھی۔ یہ برائے نام خلفاء ممالیک مصر وشام کے دست آموز اور اسیر سے زیادہ نہ تھے۔ ان خلفاء کے تقرر کا زمانہ ۹۲۱-۶۵۹ھ (۱۵۱۷-۱۲۶۱ء) تک ڈھائی سو سال کے عرصہ پر محیط ہے۔ اس طویل مدت میں سترہ (۱۷) افراد بساط سیاست پر محض سایہ کی طرح نمودار ہوئے، افلاس، ضعف اور ذلت کے مارے ہوئے ان برائے نام خلفاء کا آخری فرد محمد المتوکل علی اللہ ثالث (۲۳-۹۲۰ھ/ ۱۷-۱۵۱۴ء) مصر وشام کے فاتح عثمانی ترک سلطان سلیم اول (۲۶-۹۱۸ھ/ ۲۰-۱۵۱۲ء) کے ہاتھوں اسیر ہو کر استنبول گیا اور وہیں گم نامی کی موت مر گیا [۲۵]

مصر کے یہ عباس خلفاء، بغداد کے عباسی خلفاء کے مقابلہ میں بالکل ہیچ تھے۔ سلاطینِ مملوک ان سے بوقت ضرورت سیاسی فائدے حاصل کرتے تھے، ان کے علاوہ کسی دوسرے مسلمان حکمران نے انھیں بالکل درخور اعتناء نہ سمجھا اور ان سے سند حکومت، خلعت تشریف اور لوائے حاکمیت حاصل کرنے کی کوئی زحمت گوارا نہ کی۔ یہ سلطان الہند محمد شاہ بن تغلق شاہ کی اپچ تھی جس کی بدولت انھیں برعظیم پاک وہند میں یک گونہ اہمیت حاصل ہوئی اور اس کے جانشین فیروز شاہ نے عباسی خلیفہ المعتضد باللہ سے سند حکومت اور سید السلاطین کا خطاب اور بہمنی سلطان محمد اول (۷۶-۷۵۹ھ/ ۷۵-۱۳۵۹ء) نے اس سے سند حاصل کی۔ خیر اتنا تو ضرور ہوا کہ ان مسلوب الاختیار خلفاء کی کچھ مالی مدد ہوگئی اور ان کی فاقہ شکنی کی سبیل نظر آئی، کیونکہ ان کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ ''سیدہ زینب'' کے مزار کی مجاوری اور وہاں جلائی جانے والی شمع کی آمدنی تھی، جسے ہم برصغیر کی اصطلاح میں ''چراغی'' کہتے ہیں [۲۶] ان مصری عباسی خلفاء کی زبوں حالی کا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انھیں کوئی اختیار حاصل نہ تھا، مالی بدحالی کا وہ شکار تھے اسیری، نظر بندی اور معزولی عام تھی، ممالک مصر جب چاہتے انھیں معزول یا نظر بند کر دیتے تھے۔ مثلاً الحاکم بامر اللہ کامل ستائیس (۲۷) سالوں تک نظر بند رہا۔ بعض کئی کئی مرتبہ خلیفہ بنائے گئے اور پھر معزول کئے گئے مثلاً المتوکل علی اللہ دو مرتبہ معزول ہوا۔ بحیثیت مجموعی ان خلفاء کو اتنی بھی آزادی نہ تھی کہ

غیاث الدین محمد عباسی کی طرح کسی مملوک سلطان کو ڈانٹ پلا سکیں اور اس سے محمد بن تغلق کی طرح قدم بوسی کروا سکیں۔ ان میں سے بعض اتنے مفلوک الحال تھے کہ انھیں اور ان کے متوسلین کو دو وقت کی روٹی بھی اطمینان سے نہ مل سکتی تھی اور جب اس خاندان کے آخری خلیفہ کو سلطان سلیم اول گرفتار کر کے استنبول لے گیا اور اسے رسوا و خوار کر کے نظر بند کر دیا تو ساٹھ (۶۰) درم یومیہ اس کا وظیفہ مقرر کیا یہ رقم اس زمانے کے لحاظ سے حد درجہ قلیل تھی اور خلیفہ المتوکل علی اللہ ثالث کے وسیع کنبے کے لیے اونٹ کے منہ میں زیرہ کی بمصداق تھی۔ ہمیں اس میں بھی تامل ہے کہ ان خلفاء کو سلاطین تغلق یا سلاطین بہمنی کی جانب سے جو تحائف وغیرہ بھیجے جاتے تھے، وہ یہ سفرا خود ہضم کر جاتے ہوں گے اور اگر خوف خدا سے انھیں کچھ دے بھی دیتے ہوں گے تو ممالک مصر یا ان کے کارندے جو ان خلفاء کے نگراں تھے، اسے خرد برد کر جاتے ہوں گے۔ یوں یہ بیچارے صرف ''خطبہ'' پر ٹرخا دیئے جاتے تھے [۲۷]

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا محمد بن تغلق ان مصری عباسی خلفاء کی سیاسی حیثیت سے ناواقف تھا؛ کیا وہ عہد عباسی کے مفکرین کے افکار و خیالات سے اس درجہ متاثر تھا کہ نہ صرف عہد زوال کے برائے نام خلفاء کو مرجع عقیدت اور منبع اقتدار سمجھتا تھا، بلکہ سقوطِ بغداد کے بعد مصر میں قائم ہوتی نام نہاد خلافت کو بھی حاکم و مقتدر بالقوۃ خیال کرتا تھا، کیا وہ مصر و شام کے مملوک سلاطین کی سیاسی بازی گری سے لاعلم تھا اور یہ نہ سمجھتا تھا کہ مصر کی یہ نام نہاد خلافت ایک سیاسی شعبدہ گری اور ڈھکو سلے کے سوا کچھ نہیں ہے؟ اور کیا اسے اس حقیقت سے آگہی نہ تھی کہ عراق وایران کے حکمراں ''ایل خانی'' اور ماوراء النہر کے ''چغتائی'' سلاطین، نہ ان ممالیک مصر و شام کو درخور اعتناء سمجھتے تھے اور نہ ان کے دست آموز بے دست و پا مصری خلفاء کو کوئی اہمیت دیتے تھے؟ یہ مصری عباسی خلفاء کی بدقسمتی تھی کہ وہ بنفس نفیس دہلی نہ آئے ورنہ ان کی پذیرائی میں زمین وآسمان کے قلابے ملا دیئے جاتے، سلطنت دہلی ان کی نذر کر دی جاتی اور سلطان دہلی محمد بن تغلق شاہ خدا جانے کس حد تک گر کر ان کی تکریم و تعظیم بجا لاتا! ہمارے اس قیاس کو اس سلطانی عمل سے

تقویت پہنچتی ہے جو اس نے بغداد کے فلاکت زدہ اور سمرقند کے زوّار غیاث الدین محمد عباسی کے ساتھ روا رکھا۔ دہلی کے چار شہروں میں سے ایک شہر سیدی پورا کا پورا اسے بخش دیا، تمام مشرقی علاقے اسے جاگیر میں دیدیئے سو دیہات رواں اخراجات کے لیے عطا کئے اور بے حساب زر و جواہر اس کے نذر کئے۔ اس پر مستزاد کہ زمین بوس ہو کر اس کی کورنش بجالایا، اپنا سر زمین پر رکھ کر اپنی گردن پر اس کا پاؤں رکھوایا۔ بقول ابن بطوطہ اس طرح کی حرکت کسی بادشاہ سے نہ سنی گئی اور نہ دیکھی گئی اور بقول سرولزلی ہیگ اس تعظیم اور تقدیس غلو آمیز کو عقل و فہم سے کوئی علاقہ نہ تھا۔ غیاث الدین محمد عباسی بڑا خوش قسمت تھا کہ سلطان الہند نے اسے بے انتہا انعام و اکرام سے سرفراز فرمایا، ورنہ مصر، شام، عرب، عراق، ایران، خراسان، و ماوراء النہر بلکہ خود برعظیم میں لاکھوں عباسی موجود تھے اور ان میں اکثریت ضرورت مندوں کی تھی، لیکن وہ نوازش سلطانی سے محروم اور لذائذ دینی سے بے بہرہ ہی رہے۔ سچ ہے کہ ''ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں؟'' [۲۸]

سلطان محمد شاہ بن تغلق شاہ کی اس مبالغہ آمیز ''پذیرائی'' کی مورخین نے بعض تو جیہات کی ہیں، مثلاً یہ کہ سلطان ''پدرکش'' تھا ملک کے عوام و خواص اس کی حکومت کو ناجائز اور اسے متغلب اور غاصب سمجھتے تھے۔ اس عوامی ناپسندیدگی اور سلطنت کی غیر قانونی حیثیت کے باعث اسے وہ وقار و احترام حاصل نہ تھا جو اس کے پیشرو سلاطین کو حاصل رہا تھا، چنانچہ سلطان اپنی حکومت کو قانونی شکل دینے کی غرض سے مصر کے عباسی خلفاء سے رجوع ہوا۔ مصری خلفاء سے پروانہ حکومت، سند اقتدار اور لوائے حاکمیت کے حصول کی بناء پر اس کی حکومت کو سند جواز مل جاتی اور عوام و خواص میں اس کی بری شہرت اُس کے لیے ندامت کا باعث نہ بنتی۔ اس لیے سلطان کی عباسیوں سے غیر معمولی دلچسپی اور عقیدت، محض ذاتی وجوہ کی بناء پر تھی۔ اس میں کوئی مذہبی جذبہ کارفرما نہ تھا، یہ محض ایک سیاسی عمل تھا جو سلطان نے اپنے کرتوت پر پردہ ڈالنے اور بدنامی کو نیک نامی میں تبدیل کرنے کے لیے کیا۔ جہاں تک سلطان محمد بن تغلق کے ''پدرکش'' ہونے کی بات ہے وہ محض بات ہی بات ہے، نہ معاصر کتب تاریخ سے اس کی تصدیق ہوتی ہے اور نہ سلطان کے

کردار وسیرت سے اس کی تائید وتوثیق ہوتی ہے۔ وہ اپنے والد کے تخت نشین ہونے سے بہت پہلے سے عہد خلجی کے بڑے امراء میں شمار ہوتا تھا اور سلطان قطب الدین مبارک شاہ کے ہاں وہ بڑا معزز ومعتمد علیہ تھا۔ سلطان غازی ملک کے تخت نشین ہوتے ہی، اسے ولی عہد نامزد کیا گیا اور الوغ خان کے لقب سے ملقب کیا گیا، یوں سلطنت میں اس کی حیثیت اپنے والد کے بعد سب سے نمایاں تھی۔ اس کے والد کو اس پر اس حد تک اعتماد تھا کہ بنگال کے سفر پر جاتے وقت سلطنت کے سیاہ وسپید کا اسے مالک بنا گیا تھا۔ سلطان غیاث الدین تغلق عوام وخواص میں بے حد مقبول تھا اور اگر اس کے بیٹے فخر الدین جونا خاں کے ہاتھ اس کے خون سے رنگین ہوتے تو امراء اور خود مرحوم سلطان کے دوسرے بیٹے اور قرابت دار اسے آسانی سے اورنگ نشین دہلی نہ ہونے دیتے، بغاوتیں ہوتیں، احتجاج ہوتا اور کشت وخون کے بغیر جونا خاں محمد شاہ نہ بن پاتے۔ اس بناء پر سلطان محمد شاہ کی عباسیوں سے عقیدت مندی کی وجہ پدر کشی نہیں ہوسکتی وہ پدر کش تھا ہی نہیں۔[۲۹]

مصر کے مسلوب الاختیار خلفاء کی اس تعظیم کی اصل وجہ یہ تھی کہ سلطان محمد بن تغلق اپنی افتاد طبع اور خام خیالی کے باعث علماء، قضاۃ، مشائخ وصوفیہ سے بدظن تھا۔ عوام وخواص میں ان حضرات کی غیر معمولی مقبولیت اسے ایک آنکھ نہ بھاتی تھی، اس نے ان حضرات کو ذلیل وخوار کرنے کی بہت کوششیں کیں اور انھیں اپنے مظالم کا نشانہ بنایا۔ اسے یہ غلط فہمی ہوگئی تھی کہ اس کے خلاف جو بغاوت بھی ہوتی ہے، اس میں علماء، قضاۃ، مشائخ، اور صوفیہ کا ہاتھ ضرور ہوتا ہے۔ یہ لوگ ہر باغی امیر کو دعائیں دیتے ہیں اور اس کی پشت پناہی کرتے ہیں۔ ان وجوہ کی بناء پر وہ، ان حضرات کی جمعیت کو پراگندہ، ان کی علمی مجالس کو منتشر اور ان کی خانقاہوں کو ویران کر دینا چاہتا تھا، ان لوگوں کو ذلیل کرنے کی غرض سے ان سے وہ خدمات لینی چاہتا تھا جو ان کے مرتبہ سے پست اور ان کی حیثیت سے حد درجہ گری ہوئی ہوتی تھیں۔ اس کوشش کے سلسلہ میں اس نے ان حضرات کے مقابلہ میں اپنی حیثیت کو مستحکم کرنے کی غرض سے عباسی خلفاء مصر سے رجوع کیا۔ اس کے خیال میں ان نام نہاد خلفاء کو جو مذہبی تقدس حاصل تھا، ان سے سند توثیق حاصل کر لینے اور ان

کی توسل کے ذریعہ وہی تقدس اس کی حکومت کو حاصل ہو جائے گا اور یہ ارباب جبہ ودستار، اس کے حضور سر اطاعت خم کر دیں گے یا اگر وہ ایسا نہ کریں گے تو عوام وخواص کی نظروں سے گر جائیں گے اور ان لوگوں نے اپنے گرد تقدس کا جو ہالہ بنالیا ہے وہ مدہم ہو کر مٹ جائے گا۔ اس کے علاوہ اسے ان کے خلاف ظلم وتعدی کی سند جواز مل جائے گی اور وہ ''اسلامی معاشرہ'' سے ان لوگوں کے اثرات کو بالکل میٹ کر رکھ دیگا۔

۷۴۴ھ (۱۳۴۳ء) میں سلطان محمد بن تغلق کو مصر کے عباسی خلیفہ الحاکم بامر اللہ ثانی کی جانب سے سند حکومت عطاء ہوئی۔ یہ وہ زمانہ ہے جس میں سلطان کے خلاف بغاوتوں کا سیلاب پھوٹ پڑا تھا اور وہ انھیں فرو کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ خلافت عباسیہ کی سند جواز سے، اس کے خلاف شورش میں کوئی کمی نہ ہوئی، بلکہ اس میں روز افزوں اضافہ ہی ہوا۔ گجرات اور دکن کی غیر مختتم بغاوتوں کو فرد کرنے کی غرض سے وہ رمضان ۷۴۵ھ (جنوری ۱۳۴۵ء) میں دہلی سے روانہ ہوا اور پھر اسے واپس آنا نصیب نہ ہوا اور محرم ۷۵۲ء (مارچ ۱۳۵۱ء) میں اس نے ٹھٹھہ کے قریب سنڈا کے مقام پر انتقال کیا اور سلطان کو اپنی رعایا سے اور رعایا کو اپنے سلطان سے نجات مل گئی [۳۰]

اس بناء پر یہ دعویٰ کرنا خلاف واقعہ نہ ہوگا کہ سلطان نے جس مقصد کے تحت عباسیانِ مصر سے کافی تگ ودو اور صرف کثیر کے بعد پروانہ حکومت اور سند جواز حاصل کی تھی، وہ پورا نہ ہوا، اس کے مخالفوں میں کوئی کمی نہ ہوئی بلکہ ان میں اضافہ ہی ہوتا گیا اور اس کے مسائل سلجھنے کے بجائے الجھتے ہی گئے۔ نہ علماء، قضاۃ، مشائخ وصوفیہ کی مخالفتوں میں اور نہ امراء وسپاہ کی سرکشی میں کسی طرح کی کمی ہوئی بلکہ بنگال دکن، گجرات اور سندھ کے وسیع علاقے اس کے ہاتھ سے نکل گئے۔ اپنے اس مقصد کے حصول میں سلطان کو ناکامی کا منہ تو دیکھنا ہی تھا کیونکہ ان مصری خلفاء کو کسی قسم کا مذہبی تقدس حاصل نہ تھا اور عوام الناس میں انھیں وہ قبولیت نہ حاصل تھی جو اپنے زمانہ میں بغداد کے عباسی خلفاء کو ملی ہوئی تھی۔ ان خلفاء کو مصر وشام کی ہمسایہ عثمانی سلطنت درخور اعتناء

نہ سمجھتی تھی اور انھیں ''ممالیک'' کا ایک ڈھکوسلہ جانتی تھی۔ اور جب روانیہ میں ان کے سلطان سلیم اول نے ان ممالیک کو شکست دے کر ان کے علاقوں پر قبضہ کر لیا (۹۲۳ھ/۱۵۱۷ء) تو اس سلسلہ کے آخری خلیفہ کو اس کے جملہ امتیازات و متبرکات کے ساتھ قید کر کے استنبول لے گیا۔ ان کے زوال خاتمہ پر کوئی چشم تر نہ ہوئی اور کسی شاعر نے ان کا کوئی مرثیہ بھی نہ لکھا[۳۱]۔ البقاء للہ۔

حواشی:

[۱] برنی، تاریخ فیروز شاہی، کلکتہ ۱۸۶۲ء، ص ۴۵۷ تا ۴۵۹

[۲] ایضاً ص ۴۷۰ و ۴۷۱

[۳] ایضاً ص ۴۶۵۔۴۶۶، ابن بطوطہ، الرحلۃ، مصر ۱۹۲۸ء، حصہ دوم، صفحہ ۵۳ تا ۵۹

[۴] ضمیمہ، Agha Mahdi Hussain, The Rise And Fall of Muhammad Bin Tughluq, London, 1935

[۵] برنی، تاریخ فیروز شاہی، ص ۴۶۲، ۴۶۳؛ ۴۶۰ تا ۴۶۵

[۶] Amir Hasan Siddiqi, The Caliphate & Sultanat in Medieval Persia, Karachi, 1969,83,132

[۷] I. H.Qureshi, The Administration of Sultantat of Delhi, Karachi, 1958,pp22-29

[۸] ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، لاہور ۱۹۸۴ء، جلد ۱۳، ص ۳۴۱ شاہ معین الدین احمد، تاریخ اسلام، اعظم گڑھ ۱۹۵۳ء، جلد ۴، ص ۴۰۵ تا ۴۰۷۔

[۹] ابن بطوطہ، الرحلہ، ۲: ۴۴؛ برنی، تاریخ فیروز شاہی، ص ۴۹۹، وبعد

[۱۰] ابن بطوطہ ۲: ۴۵ تا ۴۷؛ The Cambridge History of India, Delhi, 1958, Vol III, PP160-166

[۱۱] ابن بطوطہ ۲: ۴۵ وبعد

[۱۲] ایضاً

[۱۳] ایضاً

[۱۴] ایضاً ۴۷ و ۴۸؛ The Cambridge History of India, III, PP 158,159

[۱۵] محمد الخضری، تاریخ الامم الاسلامیہ، (الدولۃ العباسیۃ) مصر ۱۹۷۰ء ص ۸ تا ۲۸؛ The Caliphate, P31

[۱۶] بغدادی، الفرق بین الفرق، مطبوعہ مکتبہ الصبیح مصر، ص ۲۹ وبعد؛ شہرستانی، الملل والنحل، مصر، ۱۹۶۱ء، جلد اول، ۱۴۶، وبعد، نیز خضری۔

[۱۷] طبری، تاریخ الرسل والملوک، دار المعارف مصر ۱۹۶۶ء، ۷: ۴۲۱۔۴۴۲؛ ابن اثیر، الکامل، بیروت ۱۹۶۷ء، ۴: ۳۲۲ وبعد۔

[۱۸] طبریٰ تاریخ، ۷: ۴۲۵ تا ۴۲۷

[۱۹] خضری، تاریخ الامم الاسلامیہ (الدولۃ العباسیۃ) صفحہ ۶۱ تا ۶۹

[۲۰] مسعودی، مروج الذہب، مصر ۱۳۸۴ء، جلد سوم صفحہ ۳۰۶ تا ۳۱۲، خضری، ص ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۹۰، ۲۳۶، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۳۴۴، ۴۸۱ وغیرہ؛ ابن الاثیر، الکامل، بضمن سنین ۱۴۵، ۱۵۹، ۱۹۹، ۲۰۰ وغیرہ۔

[۲۱] الماوردی، الاحکام السلطانیہ، مصر ۱۳۸۰ھ صفحہ ۳۰ تا ۳۴ Caliphate and Sultanate in Medievel Persia, P38

[۲۲] الماوردیؒ الاحکام السطانیہ، ص ۵ تا ۹؛ عبدالقاہر بغدادی، اصول الدین، بیروت ۱۴۰۰ھ صفحہ ۲۷۱ تا ۲۸۶؛ الفرق بین الفرق، صفحہ ۳۴۸ تا ۳۵۱؛ ابن خلدون، مقدمہ، مطبوعہ تجاریہ کبریٰ، مصر (س ن) ص ۱۹۰۔

[۲۳] الماوردی، ص ۱۰ تا ص ۱۵؛ Caliphate & Sultanate , pp 132,133,154& 204

[۲۴] The Administration of the Sultanate of Delhi, pp 28,29

[۲۵] ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، ۱۳: ۳۳۱۔۳۳۵؛ معین الدین احمد، تاریخ اسلام، جلد چہارم ص ۴۰۵ تا ۴۲۱۔

[۲۶] برنی، تاریخ فیروز شاہی، ص ۴۹۰ و ۴۹۱؛ Cambridge History of India,3:177,376

[۲۷] بضمن حوالہ نمبر ۲۵

[۲۸] بضمن حوالہ نمبر ۸ تا ۱۴

[۲۹] سید معین الحق، A short History of Sultanate of Delhi, Karachi 1956, pp 125, 126

[۳۰] برنی تاریخ فیروز شاہی، صفحہ ۵۲۵؛ Cambrige History of India, 3:172

[۳۱] شاہ معین الدین احمد ندوی، تاریخ اسلام، جلد چہارم، صفحہ ۴۳۰، ۴۳۱